میری شناخت تم ہو

(ناول)

کشمیری لال ذاکر



Author's Copy

[illegible]

25.8.95

اپنے بہت ہی پیارے رفیق اور دوست

پردیپ صاحب کی نذر

محبت اور دعاؤں کے ساتھ!

[illegible]

16 اکتوبر 1995

میری شناخت تم ہو

میری شناخت تم ہو

(ناول)

کشمیری لال ذاکر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

MERI SHANAKHT TUM HO

(Novel)

By

Kashmiri Lal Zakir

1995

Price Rs. 75.00

I S B N : 81-86232-26-5

سنہ اشاعت ________ ۱۹۹۵ء

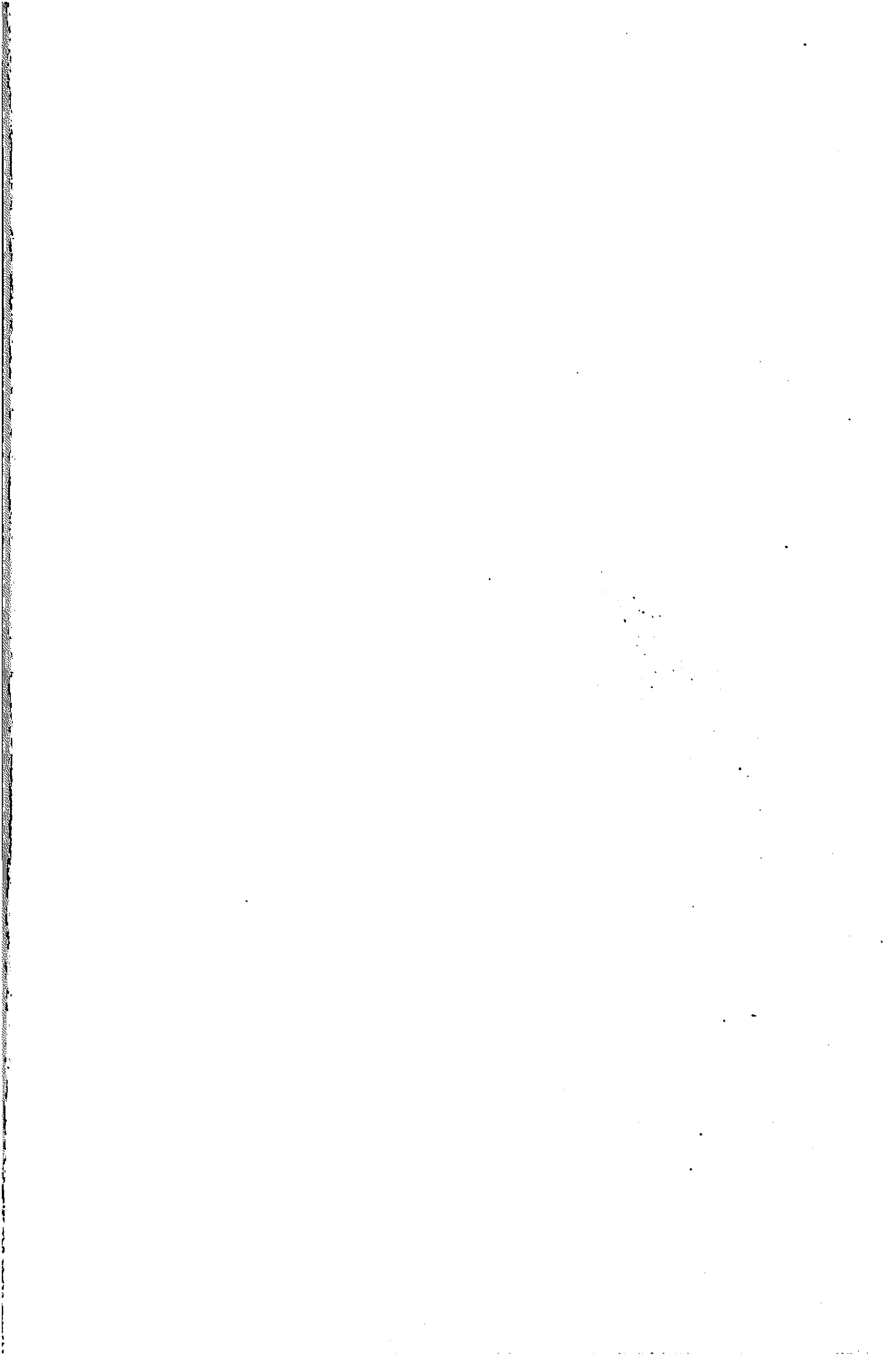
قیمت ________ ۷۵/- روپے

مطبع ________ عفیف پرنٹرس لال کنواں، دہلی - ۱۱۰۰۰۶

Educational Publishing House

3108-GALI AZIZUDDIN VAKIL, KUCHA PANDIT, LAL KUAN,DELHI-110 006. (INDIA).
TEL.: 526162/7774965

اُن دلیر اور بہادُر ڈاکٹروں کے نام
جو موت سے ڈر کر بھاگے نہیں
بلکہ سُورت شہر کی جُھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے
غریب، محتاج اور بے بس مریضوں کی خدمت کرتے رہے۔



There comes a stage in our lives when we are not the sole master of ourselves but must act as the representatives of our fellowmen.

Bal Gangadhar Tilak
(Pronouncement in a Trial in July, 1897 in the Chapekar brothers, murder case)

ہمیں سوچنا ہوگا

میرے بہت سے دوسرے ناولوں کی طرح اس ناول کا مرکزی خیال بھی انسانی رشتوں کی اہمیت ہے۔ لیکن یہ رشتے کس پیچیدگی سے آپس میں جڑے ہوئے ہیں، یہ سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ یہ رشتے ذاتی بھی ہوتے ہیں اور مجموعی بھی۔ ذاتی رشتوں میں والدین کا اولاد سے رشتہ، بہن کا بھائی سے رشتہ، دوست کا دوست سے رشتہ شامل ہیں اور مجموعی رشتوں میں فرد کا سماج سے کیا رشتہ ہے؟ اس رشتے کو سود مند اور مفید بنانے کے لیے دونوں پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں؟ یہ نکتے اہم ہیں۔ اگر فرد سماج کے تئیں اپنی ذمہ داری کو بھول جائے، تو سماج کو اس سے کیا نقصان پہونچتا ہے؟ اسی طرح جب سماج فرد کی ضرورتوں اور اس کے مسائل سے لاپرواہی برتنے لگتا ہے، تو اس سے فرد کو کیسی کیسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس پر بھی غور کرنا بہت ضروری ہے۔ اور پھر حکومت کا سماجی ڈھانچے کو ثابت و سالم رکھنا کتنا اہم ہے اور سماج کی مجموعی

فلاح و بہبود کی طرف دھیان دینا، اس کی قومی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اس کا احساس نہ کرنا سماج اور حکومت دونوں کو کتنا بڑا نقصان پہونچا سکتا ہے۔ یہ کچھ ایسے پہلو ہیں، جن کی طرف ایک ادیب، مُفکر اور دانشور کا دھیان جانا اس کی سماجی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ورنہ صفحوں پر سیاہی بکھیرتے رہنا تو کوئی بہت بڑا کام نہیں، جس پر ہم لوگ فخر کرتے رہیں۔

ہیضے کی طرح پلیگ کی بیماری ہندوستان میں شروع نہیں ہوئی تھی۔ جون ۱۸۹۷ء میں میونسپل کونسل پُونہ نے، اپنے ایک بیان میں اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ ہندوستان کے بہت سے شہر اور قصبے ہیضہ کی بیماری کے عادی ہو چکے تھے۔ لیکن پلیگ کی بیماری کا آغاز ہندوستان میں نہیں ہوا۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق یہ بیماری ۹۷-۱۸۹۶ء میں ایک سمندری جہاز کے ذریعے ہانگ کانگ سے ہندوستان پہونچی تھی۔ جہاں یہ وبا ۱۸۹۴ء میں شروع ہوئی تھی۔ پلیگ کا پہلا حملہ ستمبر ۱۸۹۶ء میں بمبئی پر ہوا۔ اور اس کے بعد یہ بیماری پُونہ، کراچی اور کلکتہ میں پہونچی۔ دو ہی سال کے اندر یہ دیہات میں بھی پھیل گئی جہاں اس بیماری سے کافی موتیں ہوئیں۔

نیچے دیئے ہوئے اعداد و شمار سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس بیماری نے بمبئی شہر اور سارے ہندوستان میں ۱۸۹۶ء سے ۱۹۱۴ء تک کتنا جانی نقصان کیا۔ سب سے زیادہ موتیں ۱۹۰۷ء میں ہوئیں :

Plague Mortality in Bombay City and India, 1896-1914

Year	Bombay	India
1896	1,936	2,219
1897	11,003	53,816
1898	18,185	116,285
1899	15,796	139,009
1900	13,285	92,807
1901	18,736	283,788
1902	13,820	538,937
1903	20,788	865,578
1904	13,538	1,143,933
1905	14,198	1,069,140
1906	10,823	356,721
1907	6,389	1,315,892
1908	5,361	156,480
1909	5,197	178,808
1910	3,656	512,605
1911	4,006	846,873
1912	1,717	306,488
1913	2,609	217,869
1914	2,941	296,623
Total	183,984	8,538,931

اس پس منظر میں، ایک نفسیاتی نکتہ بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے میں نے اس ناول میں۔ وہ ہے خوف کا جذبہ، اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے کا احساس، اپنی جان بچانے کا خیال، جب کسی کرائسس یا خطرے کے لمحے میں آدمی اپنے آپ کو ایکدم غیر محفوظ سمجھنے لگتا ہے، تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اُس کے سوچنے کی صلاحیت بھی محدود ہو جاتی ہے۔ اس کی سوچ کا دائرہ صرف اپنی ذات تک سمٹ جاتا ہے اور وہ اپنے ماحول، اپنے سماج، اپنے خاندان اور اپنے جاننے والوں سے ایک دم کٹ جاتا ہے۔ اس لمحہ اس کے سامنے صرف اپنی ذات ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ ایسے لمحوں میں کبھی وہ کھڑکی سے کُود جاتا ہے۔ کبھی چھت سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ کبھی سیلاب میں اپنے دوست یا عزیز کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے اور اپنے لیے کوئی وقتی قسم کا سہارا تلاش کر لیتا ہے۔ جو اس لمحہ اس کی جان بچا سکتا ہو۔

مجھے اس کا تجربہ تقسیم وطن کے زمانے میں ہوا تھا، جب سارے انسانی رشتے ایک دم ٹوٹ گئے تھے اور آدمی نے صرف اپنی سلامتی کے لئے سارے بندھن توڑ دیئے تھے۔ یہ

سانحے بڑے المناک تھے۔ میری آنکھیں ان سانحوں کی گواہ ہیں ۔اس تقسیم پر اس زمانے میں کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ڈر، خوف، اِن سیکیورٹی، کے احساس اور ذاتی سلامتی کے لئے، اپنی سماجی ذمہ داریوں اور ذاتی تعلقات کو نظر انداز کر دینے کے، کچھ بڑے حوصلہ شکن واقعات اس وقت سامنے آئے جب اکتوبر ۱۹۹۴ میں سُورت شہر میں اچانک پلیگ کی وبا پھُوٹ پڑی،جو ہمارے لئے ماضی کی داستان بن چکی تھی اور جس کی طرف مدت سے اب کسی کا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔وبا تو سُورت میں پھُوٹی تھی لیکن اس کا اثر بمبئی، دھلی، پنجاب، ہریانہ، راجستھان، چنڈیگڑھ اور کئی دوسرے علاقوں پر بھی پڑا۔ دھلی نے تو اس معاملے میں سب سے زیادہ فوقیت حاصل کر لی۔خاصی بدنامی ہوئی اس شہر کی اس بیماری کی وجہ سے۔

پلیگ کی بیماری نے ہندوستان کی انٹرنیشنل لیول پر بھی ساکھ کھو دی۔یہاں تک کے چھوٹے چھوٹے پسماندہ ممالک نے اپنی فلائٹیں رد کر دیں، جیسے ہر ہندوستانی میں،جو ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا، پلیگ کے جراثیم موجود تھے۔ غیر ملکی ٹُورسٹس نے تو ہوٹلوں میں اپنی بُکنگ بھی کینسل کرادیں

۔ ہندوستان جیسے ایک دم ایک کریمنل بن گیا تھا۔

لیکن کیا ہم مجرم نہیں تھے ؟ کیا ہم نے اور ہماری سرکار نے اتنے بڑے قومی کرائی سس کے دوران، اپنے فرائض کو پوری طرح نبھایا تھا؟ اگر ہم ایمانداری سے سوچیں تو اس سوال کا جواب نفی میں ملے گا۔

ایک اور سوال بھی اُبھر رہا ہے، میرے ذہن میں۔ وہ ہے پروفیشنل کوڈ آف کانڈکٹ کا۔ جب سُورت میں پلیگ نے قیامت کا سماں ڈھا دیا تھا اور مرتے ہوئے، بے بس، مجبور اور محتاج لوگوں کو، صرف دوائیوں کی اور ڈاکٹروں کی ضرورت تھی، اس وقت دوائیاں نہیں مل رہی تھیں اور اگر مل رہی تھی تو ان کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ دوائیاں ایک غریب آدمی کی بساط سے باہر تھیں۔ اسپتالوں میں مناسب میڈیکل سہولتیں نہیں تھیں۔ اسپتالوں کا ماحول بڑا ہمت شکن اور غیر محفوظ تھا اور اس سارے قیامت خیز ماحول میں ڈاکٹر اپنی اپنی جانیں بچا کر شہر سے بھاگ رہے تھے۔ اس سے زیادہ پروفیشنل مِس کانڈکٹ کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ ایسی ہی ایک مثال بنگلور اور میسور کے اسپتالوں کی ہے۔ جہاں کچھ ڈاکٹر، غریب اور نادار لوگوں کو بہکا

کر اُنکے جسم سے ان کے گُردے نکال کر فروخت کر رہے ہیں۔اپنے پروفیشن سے اتنی بڑی بےایمانی، کتنی شرمناک ہے ان سب کے باوجود، کیاہم اپنی آنکھیں اونچی کر سکتے ہیں؟

یہ ایک اور اہم سوال ہے، جو ہماری توجہ چاہتا ہے۔

بات تو صرف دس ہی دن کی تھی۔ کوئی بہت طویل عرصے کی تو نہیں تھی۔ بہت لمبا قومی کرائی سِس تو نہیں تھا۔ اس مختصر سی مدت میں نہ تو ہم نے اپنی ذاتی ذمہ داریوں ہی کو نبھایااور نہ مجموعی ذمہ داریوں ہی کی طرف دھیان دیا۔ ادھر حکومت نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی اُدھر ڈاکٹروں نے پروفیشنل مِس کانڈیکٹ کی گھٹیا مثالیں پیش کیں۔ہم قومی سطح پر کسی بھی طرح سُرخ رُو نہیں ہوئے۔ دنیا کے سامنے ہمارے سرشرم سے جھک گئے۔

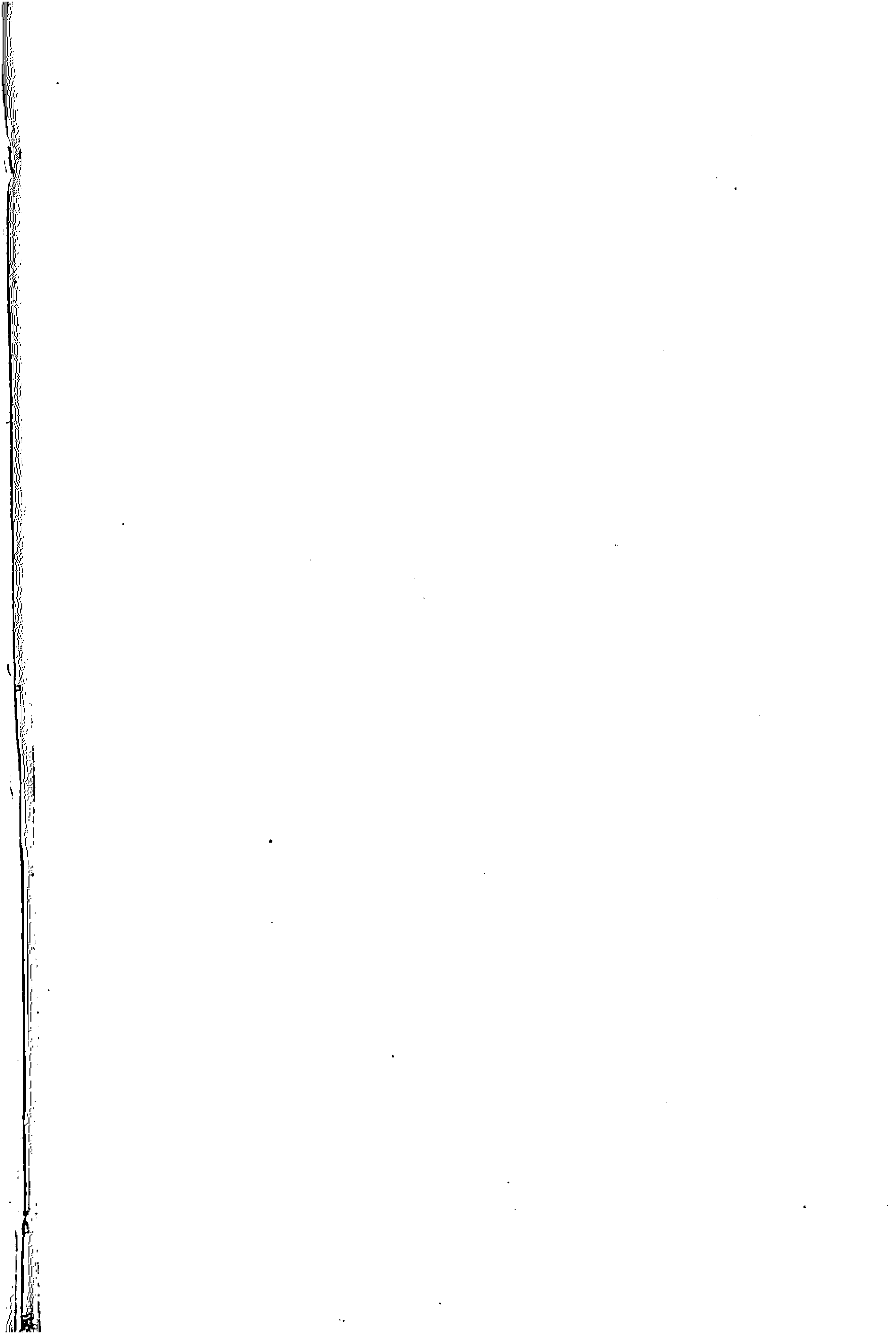
میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ کیا وہ واقعی پلیگ کا حملہ تھا، جس نے سُورت شہر کو چند ہی دنوں میں تباہ و برباد کر دیا۔ یا کوئی اور بیماری تھی جس کی وجہ سے اتنی بڑی تعداد میں انسانی جانیں تلف ہوئیں۔ یہ قدرتی عمل ہے کہ جب اس طرح کا کوئی المیہ دنیا کے کسی بھی حصے میں انسانوں کو

پیش آتا ہے اور جس سے اکثر کمزور طبقے کے لوگ ہی متاثر ہوتے ہیں ۔ تو اِنکوایری کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں ۔ طرح طرح کے بہانے تلاش کئے جاتے ہیں ، جو صرف ایک طرح کی دفتری کاروائی بن جاتی ہے اور اس دفتری کاروائی کو فائلوں میں قید کر کے Reference کے طور پر مستقبل کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے ، یہی حال سورت کی پلیگ کا ہوا ہے ۔ حال ہی میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ہیلتھ منسٹری نے National Institute of Communicable Diseases سے یہ کہا ہے کہ وہ پلیگ کے بیکٹیریا کا صحیح ماخذ تلاش کرنے اور اس کی رپورٹ منسٹری کو بھیجے ۔ رپورٹ جیسی بھی ہو گی اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا ۔ کیوں کہ انسانی المیے رپورٹوں کے چھپنے سے نہیں رُکتے ۔ کئی دوسری طرح کے اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومتیں اور عوام دونوں مل کر ایسی فضا اور ایسا ماحول پیدا کریں ، جس سے انسان اس قسم کی تباہ کن آفتوں سے محفوظ رہ سکے ورنہ دنیا بھر کے انسانوں کا مستقبل تاریک رہے گا ۔ اور وہ روشن صبح جس کے خواب ہم صدیوں سے دیکھ رہے ہیں کبھی طلوع نہیں ہو گی ۔

میں ان بہادر ڈاکٹروں کو سلام کرتا ہوں، جو اپنی ذاتی سلامتی کو نظرانداز کرتے ہوئے، ایک عظیم خطرے کا مقابلہ کرتے رہے اور ڈر کر بھاگے نہیں۔ سپاہی جب ڈر کر محاذ سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے تو وہ کتنے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، اس کا اندازہ تو وہی جرنیل کر سکتا ہے جسے شکست کے بعد اپنے ہتھیار اور کندھوں سے ایک ایک کر کے اپنے تمام دوسرے اعزازات فاتح فوجی جرنیل کے سامنے اتارنے پڑتے ہیں۔ جیسے بنگلہ دیش اور پاکستان کی جنگ میں لیفٹیننٹ جنرل اے۔ اے۔ کے۔ نیازی کو، لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے سامنے اُتارنے پڑے تھے۔

۳۶۷۔ سیکٹر ۴۴۔ اے
چنڈی گڑھ

کشمیری لال ذاکر
۱۷ اپریل، ۱۹۹۵ء



۱

تار بڑا مختصر تھا

لیکن اس میں دی گئی خبر اتنی درد ناک تھی کہ اُسے پڑھنے کے بعد انورادھا سر سے پاؤں تک لرز اٹھی تھی۔

اس نے تار کو کئی بار پڑھا اور ہر بار اُس کا ردِعمل ویسا ہی شدید تھا۔ اُسے لگا تھا کہ ایک تیز و تُند طوفان نے اس کی سموچی شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ پانی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی سانس رکنے لگی تھی اور دل کی دھڑکنیں منجمد ہوتی جا رہی تھی۔

اب شاید پاتال ہی اس کی آخری سیما ہو گی!

یوں تو اکتیس (۲۱) ستمبر کی شام ہی سے جب سورت شہر کو پلیگ کے پر و کوپ نے تہس نہس کر دیا تھا، انورادھا بے حد پریشان تھی اور اپنے بھائی ڈاکٹر اشوک کے بارے میں فکر مند تھی، جو سورت کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں ڈاکٹر تھا، جس کا نام مدر ٹریسا اسپتال تھا۔ اپنی فکر مندی کا اظہار وہ ہر روز ہی کوشل سے کرتی تھی اور وہ بھی پریشان ہوتا تھا۔ لیکن اشوک

کے تار نے تو اس کی جیسے جان ہی نکال دی تھی۔ یہ خبر اتنی غیر متوقع اور پُر درد تھی کہ انورادھا اُسے پڑھ کر ایک دم ٹوٹ گئی تھی۔

"ڈاکٹر شانتی کا کل پلیگ سے انتقال ہوگیا۔" تار رات کو ملا تھا اور انورادھا جبھی سے پریشان تھی۔

وہ آج آفس بھی نہیں گئی تھی۔ اس نے کئی بار اشوک سے فون پر بات کرنے کی بھی کوشش کی تھی، لیکن ٹیلی فون نہیں ملا تھا۔ لگتا تھا لائنیں خراب تھیں۔ جو قیامت پلیگ کی وبا نے سُورت پر اچانک ڈھائی تھی، اُس سے جیسے شہر کا پورا نظام ہی ختم ہو گیا تھا۔ اخباروں کی خبروں سے تو یہی نظر آتا تھا کہ لاکھوں لوگ سُورت چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ ٹرینیں کھچا کھچ بھری تھیں۔ ٹیکسیاں دس گُنا دام لے کر ہجرت کرنے والوں کو، دوسرے شہروں میں پہنچا رہی تھیں۔ کچھ لوگ تو اپنے سکوٹروں کا بھی استعمال کر رہے تھے۔ سُورت سے بھاگ جانے کی جیسے ہوڑ لگی تھی۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔

انورادھا کا دُکھ بانٹنے والا بھرے شہر میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے ذاتی مسائل کبھی کسی کے ساتھ ڈِسکس بھی تو

نہیں کیئے تھے۔ کوشل ہی تو اس کا واحد دوست اور رازدار تھا' جس کے سامنے وہ اپنے نجی مسئلے بنا کسی ہچکچاہٹ کے رکھ دیتی تھی اور وہ انورادھا کی ہر چھوٹی بڑی پرابلم کو اپنی پرابلم سمجھ کر سنتا تھا اور اُس کا حل بھی تجویز کرتا تھا۔ اور اِس گھڑی جب وہ ایک دم ٹوٹ کر بکھر گئی تھی' اُسے کوئی سنبھالنے والا نہیں تھا۔ کوشل بھی نہیں جو پچھلے کئی سالوں سے اس کا واحد دوست تھا' اس شہر میں جو چھوٹا ضرور تھا لیکن اس میں ہر بڑے شہر کی بُرائیاں دھیرے دھیرے رچتی جا رہی تھیں۔ پھر بھی اس "سِٹی دی بیوٹی فل" کو "سِٹی دی اگلی" بننے میں کچھ عرصہ لگے گا۔ جب تک شاید دنیا کے بہت بڑے بڑے شہر' اپنی تمام تر بُرائیوں اور قباحتوں کے ساتھ اپنا وجود کھو چکے ہوں گے۔ کوشل دو دن کے لئے چنڈی گڑھ سے باہر گیا تھا اور شاید آج رات کو واپس آئے گا۔

نوکرانی کے باربار اصرار کرنے پر انورادھا نے ناشتہ بھی کر لیا تھا اور نہا دھو کر تیار بھی ہو گئی تھی لیکن وہ صوفے کی بیک سے پیٹھ ٹیکے پڑی تھی اور روئے جارہی تھی۔ ایک ایسے شخص کی موت پر پریشان تھی وہ' جسے اس نے آج تک دیکھا

بھی نہیں تھا۔ جس کے ساتھ اس کا کوئی ذاتی رشتہ بھی نہیں تھا۔ یہ زندگی میں کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے؟ ایک ایسا واقعہ ' جس سے آپ کا کوئی ڈائریکٹ واسطہ نہیں ہوتا' آپ کو جنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور دنیا آپ کے لیے اندھیر ہوجاتی ہے۔ بجلی کہیں گرتی ہے' آشیاں کہیں جلتا ہے۔ ایک ایسا آشیاں ' جسے مکمل کرنے میں آپ نے ایک بھی تنکا نہیں چُنا ہوتا۔

کیوں ہوتا ہے ایسا؟

ایسا آخر کیوں ہوتا ہے؟

اشوک خط لکھتا ہی کہاں تھا۔ بہت ہوا تو مہینہ بھر بعد کسی رات کو انورادھا سے ٹیلی فون پر بات کر لی۔ وہی عام سی باتیں۔ موسم کی' کسی نئی فلم کی' کسی مریض کی یا پھر شانتی کی۔ اور یا پھر انورادھا کے آفس کی کوئی بات۔ دراصل اشوک بڑا کم گو آدمی تھا۔ وہ جتنا اچھا ڈاکٹر تھا' بات چیت میں اتنا ہی نکما تھا۔ کمیونی کیشن کا آرٹ تو اس میں تھا ہی نہیں۔ اپنے مریضوں سے بھی وہ زیادہ نہیں کھلتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ مریض کو مریض ہی رہنا چاہیئے' ڈاکٹر کا دوست نہیں بننا چاہیئے۔ مریض سے وہ صرف پروفیشنل قسم کا رشتہ رکھنے کا ہی حامی تھا۔ مریض

اگر دوست بن جانے کی لیول پر آجائے تو ڈاکٹر کا وقت بھی
ضائع ہوتا ہے اور دوسرے مریضوں کی طرف اس کی توجہ بھی
قدرے کم ہوجاتی ہے۔اسے اشوک پروفیشنل بے ایمانی کا نام
دیتا تھا۔ اس کے مریض اس کو ایک قابل ڈاکٹر تو سمجھتے تھے،
لیکن اس سے کسی قسم کا ذاتی رشتہ قائم نہیں کر سکتے تھے۔ وہ
مریضوں کے لئے اپنا وقت، اپنی مہارت، یہاں تک کہ اپنا روپیہ
پیسہ تو دے سکتا تھا لیکن اپنی پرائی ویسی نہیں۔اپنے دل ودماغ
کے دروازوں پر وہ کسی کو بھی دستک دینے کی اجازت نہیں
دیتا تھا۔ اس کے اوقات مقرر تھے۔ یہ نہیں کہ کسی نے جب چاہا
اس کے دل ودماغ کے دروازوں کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ کبھی
کبھی وہ اس سے بو کھلا بھی اٹھتا تھا۔

کوئی پندرہ روز پہلے ہی کی تو بات تھی۔

شانتی نے رات کو ٹیلی فون کیا تھا۔

"میں نے اور میری کچھ فرینڈز نے گوا جانے کا
پروگرام بنایا ہے۔"

"کب؟"

"اگلے سنڈے کو۔"

"تو جاؤ۔"

"آپ کو بھی چلنا ہے ۔ہم لوگ سٹیمر سے چلیں گے ۔ آپ کی ریزرویشن بھی کروالی ہے۔"

"میں نہیں جا سکتا۔"

"دو دن میں واپس آجائیں گے۔"

"کہہ جو دیا میں نہیں جا سکتا۔"

"مگر کیوں ؟"

"میں نے کچھ مریضوں کو ٹائم دے رکھا ہے۔"

"اتوار کو تو مریض نہیں دیکھے جاتے۔"

"مگر میں دیکھتا ہوں۔ ڈاکٹر کے لئے اتوار یا کسی اور اوف ڈے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔"

"تو میں کانتی بھیا سے کہہ دیتی ہوں۔وہ آپ کے مریضوں کو اٹینڈ کرلیں گے۔"

"مائی ڈیر ڈاکٹر شانتی اگروال ، مریض جائیداد کی طرح کسی دوسرے کے نام منتقل نہیں کیے جاتے۔ یہ بات پروفیشنل کانڈکٹ کے خلاف ہے۔ میرے مریضوں کی ذمہ داری میری ہے، کسی اور ڈاکٹر کی نہیں۔ اپنے مریضوں کو میں

ہی دیکھوں گا، کوئی دوسرا ڈاکٹر نہیں۔"

"تو میں اپنا پروگرام کینسل کردوں اور اپنی فرینڈز کے سامنے ذلیل ہوں، یہی چاہتے ہیں نہ آپ؟"

"یہ تمھارا پرسنل معاملہ ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

شانتی نے بحث نہیں کی تھی اور اس نے گوا جانے کا پروگرام کینسل کر دیا تھا۔ لیکن اسے افسوس بہت ہوا تھا اس بات کا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ آدمی ایڈجسٹ کرنے کا عادی ہی نہیں تھااور اس سے شانتی نے شادی کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس فیصلے میں اس کا بھائی ڈاکٹر کانتی اگروال، مدر ٹریسا اسپتال کا مالک بھی شامل تھا۔ جو ڈاکٹر اشوک کا کلاس فیلو بھی تھا اور اس وقت اس کے اسپتال میں سینئر ڈاکٹر بھی تھا اور اس کا دوست بھی۔ کئی دفعہ وہ واقعی سوچتی بھی تھی کہ اصولوں کے مارے ہوئے اس شخص سے اس کی شادی کامیاب بھی رہے گی یا نہیں۔ اور ادھر اشوک نے اپنی بہن انورادھا سے پچھلے کئی خطوں میں اس بات کا ذکر بھی کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کانتی اگروال کی بہن ڈاکٹر شانتی اگروال سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اس نے انورادھا کی رائے بھی چاہی تھی۔ انورادھا

نے فیصلہ اشوک پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے ذاتی معاملوں میں
دخل دینا نہیں چاہتی تھی، کیونکہ اسے خود یہ گوارا نہیں تھا کہ
کوئی شخص اس کے معاملات میں دخل دے۔ ہاں اس نے اشوک
کو یہ ضرور لکھا تھا کہ وہ شانتی کو کبھی چنڈی گڑھ لے آئے تا کہ
وہ اسے دیکھ بھی لے اور اپنی رائے بھی دے دے۔ یہ طے ہوا
تھا۔ کہ وہ کرِسمس کے دنوں میں شانتی کو لے کر چنڈی گڑھ
آئے گا اور اپنی بہن کا آشیرواد حاصل کرے گا۔ اور اسے "سِٹی
دی بیوٹی فُل" میں جی بھر کر گھمائے گا۔ خاص طور پر اسے
راک گارڈن دکھائے گا جس کے بارے میں شانتی نے بہت کچھ
سن رکھا تھا اور پڑھ بھی رکھا تھا۔ انورادھا نے اس بات کا ذِکر
کوشل سے بھی کیا تھا۔ اور اسے کرِسمس کا بڑی بےچینی سے انتظار
تھا، جب اس کا بھائی بہت دنوں بعد اسے ملنے آرہا تھا اور اپنے
ساتھ اس لڑکی کو بھی لا رہا تھا۔ جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔
اس گجراتی لڑکی سے، جس کا بھائی میڈیکل کالج میں اس کا کلاس
فیلو بھی تھا اور دوست بھی۔ اور اب دونوں ایک ہی اسپتال میں
کام رہے تھے۔ کوشل کو بھی انتظار تھا دونوں کا، ڈاکٹر اشوک کا
اور اس کی دوست ڈاکٹر شانتی کا۔

انورادھا واقعی بے حد پریشان تھی۔

دوپہر تک وہ ویسی ہی صوفے پر پڑی رہی۔ اس کے بعد پلنگ پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر کے کچھ دیر سو جانے کی کوشش کرتی رہی۔ جب نیند نہیں آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نوکرانی کام نمٹا کر جاچکی تھی۔ اب وہ شام ہی کو آئے گی کھانا بنانے کے لئے۔ انورادھا کافی دیر خالی الذہن رہنے کے بعد، باتھ روم میں چلی گئی۔ ہاتھ منہ دھونے کے بعد تھکن اور اکتاہٹ کچھ کم ہوئی، تو اسے چائے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آج تو بس ایک ہی پیالی چائے لی تھی اس نے۔ اس کے بعد تو چائے کا خیال ہی نہیں آیا تھا اسے۔ اس نے کچن میں جا کر گیس کے اوپر چائے کا پانی رکھا اور پانی ہی میں چائے کی پتی اور دودھ اور شکر سب ملا دئیے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے جی ٹی روڈ پر معمولی ڈھابہ چلانے والے، ٹرک ڈرائیوروں کے لئے چائے بناتے ہیں۔ ٹرک ڈرائیوروں کی چائے سپیڈ کے مطابق بنتی ہے۔ ایک سو کلو میٹر والی، ڈیڑھ سو کلو میٹر والی، دوسو کلو میٹر والی اور ڈھائی سو کلو میٹر والی چائے۔ کبھی کبھی پانچ سو کلو میٹر والی چائے بھی بناتے ہیں ڈھابے والے، لیکن وہ زرا خطرے والا معاملہ ہوتا

ہے - لیکن اچھا ٹرک ڈرائیور تو وہی ہے' جو ہر دم اپنی جان
ہتھیلی پر رکھے اور گھر سے جب چلے تو گھر والوں کو اس انداز
سے ملے جیسے وہ ان سب سے آخری بار مل رہا ہو۔ پھر شاید وہ
اپنی بیوی سے' اپنے بچوں سے' اپنی ماں سے کبھی نہ مل سکے -
اور اپنی محبوبہ سے یہ شعر کہ کر اس سے الوداع لے۔

میں لوٹنے کے ارادے سے جا رہا ہوں مگر
سفر سفر ہے میرا انتظار مت کرنا ____

چائے پیالی میں ڈال لینے کے بعد انورادھا صوفے پر
نہیں بیٹھی۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ لگی ایک کرسی کو
سرکایا اور ٹیبل پر کہنی ٹیک کر بیٹھ گئی اور گرم گرم تیز
چائے کے ہلکے ہلکے سِپ لینے لگی - وہ چائے بھی پیتی رہی اور
اپنے ماضی کی کتاب کے صفحے بھی دھیرے دھیرے الٹتی رہی -
کتاب کے صفحے وہ کسی ترتیب سے نہیں الٹ رہی تھی۔ جس
صفحے پر انگلی ٹِک گئی اس کو کھول کر سامنے رکھ لیا اور اسی پر
دیر تک دھیان لگائے رکھا۔

۲

ماضی کے جس لمحے پر انورادھا کی آنکھیں جمی تھیں وہ بڑا دردناک لمحہ تھا۔

اس کے پتا کی ارتھی اُٹھ رہی تھی۔

گھر میں کہرام مچا تھا۔

گاؤں کے دس لوگ ہری دوار گئے تھے، گنگا اشنان کے لئے۔ اُن دس لوگوں میں انورادھا کا پتا بھی شامل تھا۔ اس کی ماں بھی گنگا اشنان کے لئے جانا چاہتی تھی۔ چونکہ گاؤں کی کوئی عورت چلنے کو تیار نہ ہوئی تھی، اس لئے انورادھا کی ماں نے ہری دوار جانے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔ پرسوں وہ لوگ واپس آئے تھے اور اپنے ساتھ گنگا جل کی بوتلیں بھی لائے تھے، اپنے سگے سمبندھیوں میں بانٹنے کے لئے۔ پر اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا انہیں۔ واپس پہنچتے ہی دسوں کے دسوں آدمیوں کو ہیضہ ہوگیا تھا اور ان میں سے ایک بھی نہ بچا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد سبھی مر گئے تھے۔ مرنے والا آخری آدمی انورادھا کا پتا تھا، پنڈت امرناتھ۔

گاؤں کا سکول، جس میں انورادھا اور اشوک پڑھتے تھے بندکر دیا گیا تھا۔ اور گاؤں کے بہت سے لوگ اپنے گھر چھوڑ کر، سکول کے کُھلے میدان میں آگئے تھے۔سکول کے کمروں میں کوئی نہیں ٹھہرا تھا۔ انورادھا کی ماں نے گھر نہیں چھوڑا تھا۔ آس پڑوس کے گھروں سے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازوں سے خوفزدہ ہو کر، دونوں معصوم بچے دیوار کے ساتھ لگے، خاموش بیٹھے تھے اور اپنے پتا کی پل پل بگڑتی حالت کو دیکھ کر رو رہے تھے اور پھر جب انھوں نے اپنی ماں کی زوردار چیخ سُنی تو انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کا پتا پرلوک سِدھار گیا تھا۔ گنگا جل سے بھری بوتل، جس میں سے انورادھا کی ماں، اس کے پتا کے منہ میں تھوڑا تھوڑا جل ڈالتی رہی تھی، ایک طرف اُلٹی پڑی تھی اور اس میں سے گنگا کا پوتر جل نکل نکل کر کچے فرش میں رچتا جارہا تھا اور اس کی پتا کے مردہ جسم کے سرہانے آٹے کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔

انورادھا اور اشوک دونوں نے ڈر کر چیخ ماری اور دھاڑیں مارتی ہوئی اپنی ماں سے چمٹ گئے۔

اورجب گاؤں کے لوگوں نے پنڈت امرناتھ کی ارتھی

اٹھائی اور رام نام ست ہے، کا اُچارن کرتے ہوئے شمشان کی
طرف چلے تو انورادھا کی ماں دونوں بچوں کو اپنے ساتھ چمٹائے،
ننگے پاؤں گھر کے کواڑ کھُلے چھوڑ کر، اپنے پتی کی ارتھی کے
پیچھے پیچھے چلنے لگی - اس کی آنکھوں کے سامنے گاؤں کے شمشان
میں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد لائی گئی نو لاشوں سے
اٹھتے ہوئے آگ کے شعلے لہرانے لگے اور وہ کچی گلی کی ایک
طرف بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اس کے جسم کے ساتھ چمٹے
ہوئے اس کے دونوں بچے بھی اسی کے ساتھ کچی گلی میں گر
پڑے تھے۔ بچوں کے پتا کی ارتھی چار آدمیوں کے کندھوں پر
ٹکی دھیرے دھیرے شمشان کی طرف بڑھے جا رہی تھی۔

اس رات انورادھا کی ماں گھر میں تالا ڈال کر اپنے
دونوں بھوکے پیاسے بچوں کو سنبھالے، گاؤں کے سکول
کے کھُلے میدان میں آ گئی تھی۔

ہری دوار کی یاترا سے واپس آئے یاتریوں میں سے
آخری یاتری بھی پرلوک سدھار گیا تھا۔

سکول کئی دنوں تک بند رہا۔

کئی دنوں تک لوگ سکول کے، کھُلے میدان میں

پڑے رہے۔ کئی روز تک عورتیں اور مرد اپنے گھروں میں نیم کے پتے جلا جلا کر اور ان کی راکھ گھروں اور گلیوں میں بکھیر کر واتاورن کو شُدھ کرتے رہے۔ اور اس دوران سرکاری آدمی گاؤں میں آکر اپنی رپورٹ مکمل کرنے میں لگے رہے اور گلیوں میں چونا چھڑکتے رہے اور کنوؤں میں لال دوائی گھولتے رہے۔ لیکن یہ سب اس وقت ہوا جب گاؤں میں قیامت آکر چلی بھی گئی تھی۔ قیامت کے دوران سرکار سوتی رہی تھی۔ سرکاریں تو قیامت کے بعد ہی جاگا کرتی ہیں۔ وہ اس وقت جاگتی ہیں جب عوام کی تقدیریں گہری نیند سو چکی ہوتی ہیں۔

سرکاروں کا عوام کی تقدیروں سے بڑا گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے!

جب تک سرکاریں اور عوام رہیں گے، یہ رشتہ قائم رہے گا۔ سرکاریں سوتی رہیں گی اور عوام لُٹتے رہیں گے۔

اپنے پتا کی موت کا یہ لمحہ ایک سُلگتی ہوئی مہر بن کر انورادھا کے دل و دماغ سے چپک گیا۔ اسی لیے تیرتھ استھانوں کے لئے اس کے دل میں کبھی عقیدت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ کبھی کسی تیرتھ استھان پر نہیں گئی۔ اسے ہمیشہ ہی لگا کہ ان

جگہوں سے لوگوں کو مُکتی نہیں موت ملتی ہے۔ بہت برسوں کے بعد جب اس نے ہیلتھ ڈیپارٹمینٹ جوائن کیا تو اس نے ہیضہ کی بیماری سے متعلق جو بھی معلومات مل سکتی تھیں، حاصل کیں اور اس کا یہ خیال اور بھی مضبوط ہوتا گیا کہ جب تک وہاں پورے حفاظتی انتظامات نہ ہوں، کسی بھی شخص کو کسی تیرتھ استھان پر نہیں جانا چاہیے۔

انورادھا کی معلومات کے مطابق انیسویں صدی میں کوئی بھی بیماری اتنی تباہ کن ثابت نہیں ہوئی تھی جتنی کی ہیضہ کی وبا۔ حقیقت میں ہیضہ ایک شدید سیاسی بیماری ثابت ہوئی تھی جس نے ہندوستان میں برطانیہ سرکار کی بُنیاد کو کمزور کرنے کا خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ اس بیماری نے بدیشی طاقت اور محکوم ہندوستانیوں میں ایک زبردست تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ مغرب کے لوگ انیسویں صدی کی ابتدا میں اس بیماری کے وجود سے واقف نہ تھے لیکن ۱۸۱۷ میں ہیضہ کی وبا نے، نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں خوف وہراس کی لہر دوڑا دی۔

بنگال میں سب سے زیادہ نقصان ہوا تھا۔ بنگال میڈیکل بورڈ کے لئے جیمز جیمسن نے ہیضہ سے اموات کے جو اعدادوشمار

اِکٹھے کئے، ان کے مطابق بنگال کے کئی ضلعوں میں اگست ۱۸۱۷
میں وبا کے پھوٹنے کے بعد، دو مہینوں ہی میں دس ہزار لوگ
مر گئے ۔ کلکتہ اور اس کے گردو نواح کے علاقوں میں ستمبر ۱۸۱۷ء
سے جولائی ۱۸۱۸ء تک ہیضہ کے ۲۷،۰۰۰ کیس ہوئے ۔ لیکن اس
حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ اس بیماری کا زیادہ اثر جُھگی
جھونپڑیوں میں رہنے والوں پر ہوا۔ غیر ملکی لوگ جو مقابلتاً بہتر
جگہوں میں رہتے تھے، اس بیماری کا شکار نہیں ہوئے ۔ اسی طرح
ان ہندوستانیوں پر بھی کم اثر پڑا، جو شہر کے نسبتاً کھلے
علاقوں میں قیام پذیر تھے۔ بعد میں ایک اور انکشاف بھی ہوا، وہ
یہ کہ قحط اور ہیضہ کا آپس میں بڑا گہرا تعلق تھا ۔ مدراس پریزی
ڈینسی میں ۱۸۶۹ اور ۱۸۷۱ کے دوران جب زبردست قحط پڑا ۔ ہیضے
کی وبا سے ایک لاکھ موتیں ہوئیں۔ اس کے اسباب پر غور کیا گیا
تو معلوم ہوا کہ قحط سالی کے دوران جب لوگ اپنے ٹھکانے
چھوڑنے لگے، تو انھیں پینے کا پانی کنوؤں، تالابوں اور جوہڑوں
سے ملا جن میں ہیضہ کے جراثیم جمع ہو چکے تھے۔ بیماری سے ڈر
کر بھاگنا ہی ان کی موت کا کارن بنا۔

جس سانحہ نے برطانوی حکومت کو بے حد پریشان کیا

وہ ۲۱-۱۸۱۷ کے دوران فوجیوں میں ہیضہ کی وبا کا پھیلنا تھا، جو نومبر ۱۸۱۳ میں بندھیل کھنڈ میں پِنڈاروں اور مرھٹوں کے حملوں کو روکنے کے لئے جمع تھے۔ جیمز جیمسن نے اس وبا کو دشمن کی طرف سے ایک ایسا مہلک وار قرار دیا، جو انگریزی فوجوں پر اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا تھااور جس سے فوجوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے۔ تھوڑے ہی وقفے میں فوجیوں کی اتنی زیادہ موتیں ہوئیں کہ ہر طرف مرنے والوں کی کراہیں گونجتی تھیں اور ان کی موت پر ماتم کی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ انگریزی سرکار کے لئے ہیضہ کی بیماری ایک بہت بڑا دشمن بن گئی۔

توہم پرست اور اندھ وِشواس کے مارے ہوئے ہندوستانیوں نے تو بیماریوں کو بھی دیوی دیوتاؤں کا رُوپ دے دیا ہے۔ جس طرح لوگ چیچک کو کالی دیوی کا رُوپ سمجھ کر اُسے پُوجنے لگے۔ اسی طرح بنگال، بمبئی، کونکن اور کئی دوسرے علاقوں میں ہیضہ کی بیماری نے دیوی، اوتار اور گورو کا رُوپ لے لیا اور انپڑھ اور جاہل عوام انہیں کی پُوجا میں لگ گئے اور بھُول گئے کہ بیماری کا علاج دوا سے ہوتا ہے۔ اندھ وِشواس سے نہیں۔ وہ اس اہم بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں

کرتے تھے کہ بیماری کو روکنے کے لئے، جگہوں کی صفائی، گھروں کی صفائی ۔ کنوؤں اور تالابوں کی صفائی ضروری ہے نہ کہ پاکھنڈیوں کی پُوجا۔

ہیضہ کے بارے بہت سی معلومات حاصل کرنے کے بعد، انورادھا کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ بیماریوں کا سیدھا تعلق تہواروں اور تیرتھ استھانوں سے تھا۔ اپریل ۱۸۶۷ میں ہری دوار کے کمبھ میلے میں تیس (۳۰) لاکھ یاتری گئے ۔ ۱۲ اپریل کو لاکھوں لوگوں نے گنگا میں اشنان کیا۔ اگرچہ ہیضہ سے ہری دوار میں تو صرف اُنیس لوگ مرے، لیکن اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہوئے راستے میں ہر جگہ چاہے وہ تالاب تھے یا کنوئیں تھے یا گاؤں تھے، یا سڑکیں تھیں، بیماری کے جراثیم چھوڑتے گئے اور ۱۸۶۷ کی ہیضے کی وبا نے، جس کی شروعات ہری دوار کے میلے سے ہوئی تھی، لاکھوں لوگوں کی جانیں لے لیں ۔ یہ سانحہ صرف ہری دوار تک ہی نہیں تھا۔ اس میں الٰہ آباد، اُڑیسہ میں جگن ناتھ، مہاراشٹر میں ناسِک ۔ آندھرا پردیش میں ترِوپتی اور تامل ناڈو میں کانجی پُورم، سبھی تیرتھ استھان شامل تھے۔ جہاں لوگ پُن کمانے جاتے تھے اور یم راج کو ساتھ لے

کر آتے تھے۔ لوگ مر بھلے جائیں لیکن تیرتھ استھانوں پر جانا نہیں چھوڑیں گے۔ ساری بات سنسکاروں ہی کی تو ہے۔ اور ہم سب سنسکاروں ہی کے تو مارے ہوئے ہیں۔

۱۸۹۲ میں شمال مغربی صوبائوں کی سرکاروں نے ایک بڑا جُرات آمیز قدم اٹھایا۔ انھوں نے مارچ کے آخری دنوں میں ہری دوار کے مہاوارونی میلے میں شامل ہونے والے یاتریوں کو ہری دوار جانے سے روک دیا اور انہیں واپس بھیج دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ لوگوں نے اشتعال میں آکر احتجاج نہیں کیا، لیکن جولائی میں لاہور میں ایک بہت بڑے جلسے میں، جس کی صدارت پنڈت گوپی ناتھ جرنلسٹ نے کی، ایک ریزولیشن پاس کیا جس میں رنج و غصہ کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ یاتریوں کو میلے میں شامل ہونے سے روکنے سے سارے ملک میں بے چینی اور بے اطمینانی کی فضا پھیل گئی تھی۔ لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تک ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے نقشے موجود تھے۔ میلے میں شامل ہونے والے یاتریوں کو یوں کھدیڑ دینے کا ردِعمل اتنا شدید تھا کہ خود لارڈ رابرٹس، ہندوستانی فوج کے کمانڈر انچیف، نے عوام کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"برٹش گورنمنٹ کے کچھ فیصلے جن پر ہندوستانی عوام نے احتجاج کیا ہے ان میں ۱۸۹۲ میں ہری دوار کے میلے کو بند کرنا بھی شامل ہے، ہندوستانیوں نے اسے ان کے مذہبی معاملات میں کھلم کھلا دخل اندازی قرار دیا ہے اور اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ کے اس اعلان کے سراسر خلاف ہے، جس میں ملکہ نے کہا تھا کہ اس کی سرکار ہندوستانیوں کے مذہبی اعتقادات اور جذبات کا احترام کرے گی۔ ہری دوار کے تیرتھ استھان نے انورادھا کے تحت الشعور میں ایک ایسی گانٹھ ڈال دی جو کبھی نہ کھل سکی۔ جب کہیں ہری دوار کا ذکر آتا انورادھا کو اپنے پتا پنڈت امرناتھ کی موت کا منظر یاد آجاتا۔ اُسے لگتا کہ اُس کے عین سامنے اُس کے پتا کی لاش پڑی ہے اور لاش کے سرہانے آٹے کا دیا جل رہا ہے اور گنگا جل سے بھری بوتل اوندھی پڑی ہے اور اُس سے نکلتا ہوا پَوتر جل کچے فرش کی مٹی میں رچتا جا رہا ہے۔ انورادھا کے لئے ہری دوار موت کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔

بہت برس بعد اس کے سامنے شادی کا ایک بہت ہی اچھا پروپوزل آیا، جسے اُس نے صرف اِس لئے نامنظور کر دیا کہ

لڑکا بھارت ہیوی الیکٹریکل لمیٹڈ میں انجنیئر تھا اور یہ فیکٹری
ہری دوار میں تھی۔ اور ہری دوار میں بہتی ہوئی گنگا کا پَوِتر پانی
اب بھی ایک اوندھی پڑی بوتل سے اُس کی رُوح میں رِچتا جارہا
تھا۔

۳

چائے بھی ختم ہو گئی تھی اور انورادھا کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک بھی گئی تھی۔

وہ کرسی سے اٹھی اور اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ بے حد تھکا ہوا تھا۔ کچھ لمحے آئینے کے سامنے کھڑی رہنے کے بعد، اس نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں اور اپنے سامنے ماضی کی کتاب ایک بار پھر کھول لی۔ کتاب کے ورق اُلٹتے اُلٹتے اس کی آنکھیں ایک بار پھر ایک صفحے پر اٹک گئیں۔ یہ صفحہ گویا ایک جزیرہ تھا، جو دوسرے جزیروں سے ایک دم کٹ گیا تھا اور اُس نے اپنی الگ شناخت بنالی تھی۔

شمالی ہندوستان کا ایک معمولی سا شہر۔

اُس شہر کا ایک گنجان محلہ

اُس محلے میں ایک چھوٹا سا گھر۔

اور اُس گھر میں رہنے والے صرف تین افراد۔

ماں، بیٹی اور بیٹا۔

ودھوا ماں اور بے باپ کے دو بچے جواب ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ ودھوا ماں جو دوسروں کے کپڑے سی کر اپنی گرہستی چلاتی تھی۔

بچے ابھی ابھی سکول سے آئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ ماں انہیں کچھ کھانے کو دے گی۔ کیونکہ وہ بھوکے تھے۔

پنڈت امرناتھ کی موت کے بعد' اس کی بیوہ رُکمنی دیوی اور بچے ' انورادھا اور اشوک گاؤں ہی میں رہے لیکن بچوں کی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے گاؤں کو چھوڑنا ضروری تھا۔ رُکمنی کی یہ بڑی خواہش تھی کہ اس کے بچے اچھی تعلیم حاصل کریں اور انھیں سماج میں اچھی حیثیت حاصل ہو۔ اس کے دُور کے دو تین رشتے دار' شہر میں رہتے تھے۔ وہ ان کے کہنے پر شہر چلی آئی اور گاؤں کے گھر میں تالا ڈال دیا۔ شروع شروع میں تو دوسرے تیسرے مہینے رکمنی گاؤں آجایا کرتی تھی اور گھر کی بھی دیکھ بھال کر لیتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا گاؤں میں آنا کم ہوتا گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شہر میں گذارہ کرنے کے لئے اُسے بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ اور پھر بچوں کی پرورش کا بھی بوجھ اُسی اکیلی جان پر تھا۔ چار پانچ سال بعد رکمنی کا اپنے

گاؤں سے رشتہ کٹ سا گیا اور اس نے اپنا گھر اور زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا اپنے ہی ایک رشتہ دار کو بیچ دیا اور اس طرح جو رقم ملی وہ اس نے ڈاک خانے میں جمع کرا دی ۔ اُس رقم میں سے اُس نے ایک پائی بھی خرچ نہ کی ۔ نہ جانے کب اُسے اچانک پیسوں کی ضرورت پڑ جائے۔ گھر کا خرچہ چلانے کے لئے اُس کے رشتے داروں نے رُکمنی کو کپڑے سینے کا کام دلوادیا تھا۔ اس کا ہاتھ بڑا صاف تھا۔ کڑھائی میں بڑی نفاست بھر دیتی تھی وہ ۔ دھیرے دھیرے عورتوں اور بچوں کے کپڑے سینے کا کام اُسے اتنا زیادہ ملنے لگا کہ کئی بار اُسے آدھی آدھی رات تک مشین چلانی پڑتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ انورادھا اور اشوک تو سو جاتے تھے اور وہ کام کرتی رہتی تھی۔

پچھلے دو دن میں کام کی یہی کیفیت تھی۔ اس مہینے میں دو تین تہوار تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد آرہے تھے پہلے کروا چوتھ کا برت تھا، پھر دسہرے کا تہوار اور پھر دیوالی ۔ نئے کپڑے سلانے والوں کی گویا بھیڑ لگ گئی تھی ۔ بچے جب سکول سے واپس آئے تھے، ان کی ماں اُس وقت بھی کپڑے سی رہی تھی۔وہ کتابوں سے بھرے اپنے بستوں کو دوسرے

کمرے میں پھینک کر اُس کے سامنے کھڑے تھے ۔ اشوک ماں سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ محلے کی .بھرے .بھرے جسم والی ایک عورت آدھمکی' اس کے کپڑے قیمتی تھے ، اس کے سونے کے زیورات خوب چمک رہے تھے اور اس کی کلائیوں میں رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ شاید یہ کرواچوتھ کے برت کا سواگت تھا۔اس عورت نے اشوک کی ماں کو بڑے تیکھے لہجے میں مخاطب کیا۔

"رُکمنی ہمیں کسی اور درزن کا انتظام پڑے گا۔ تم تو کبھی وقت پر کپڑے نہیں سیتیں۔"

"آپ ہی کے کپڑے سِل رہے ہیں بہن جی۔صبح تیار ہو جائیں گے۔"

رُکمنی نے بڑے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"کپڑے نہیں سِل سکتے تو واپس کر دو ۔ تمھارا دماغ اب اونچا ہو گیا ہے ۔"

وہ عورت غصہ سے بولی۔

"آپ لے جائیے اپنے کپڑے۔میری ماں آپ کے کپڑے نہیں سیئے گی۔"

اشوک نے ادھ سِلے کپڑوں کا ڈھیر اُٹھا کر اُس بھرے
بھرے جسم والی عورت کے آگے پھینک دیا۔
"تم بدتمیز ہوتے جارہے ہو۔" رُکمنی نے زور کا ایک تھپڑ
اشوک کے گال پر مارا۔ "بہن جی معاف کردیں۔"
محلے کی عورت غصے میں پھکتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی
اور رُکمنی اشوک کو ڈانتی رہی۔ اشوک کچھ نہیں بولا۔ انورادھا
بھی خاموش رہی۔ اس رات دونوں بچے بھوکے پیٹ سو گئے تھے
اور رُکمنی کھاٹ پر پڑی روتی رہی تھی۔
لڑکپن میں گال پر کھائے ہوئے تھپڑ کا نشان، اشوک
کے ذہن میں آج بھی سلگ رہا تھا۔ اور اس نشان کی جلن ہمیشہ
اسے اس حقیقت کی یاد دلاتی رہتی تھی، کہ سماج کے اونچے طبقے
سے جب کوئی حاجت مند انصاف مانگتا ہے، اس کے ساتھ یہی
سلوک ہوتا ہے۔ یا تو انصاف مانگنا چھوڑ دو اور یا پھر اپنے دماغ
کو تھپڑوں کی جلن سے داغے جانے کے لئے ہر دم تیار رہو۔
یہ فیصلہ تمھیں خود کرنا ہے اپنے آپ سے۔
کوئی دوسرا تمھارے لئے یہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔
انورادھا نے ماضی کی کتاب کا صفحہ اُلٹا تو اُسے لگا کہ

اشوک کے گال پر پڑا تھپڑ' آج تک اس کے اپنے دماغ میں بھی سُلگ رہا تھا۔اس نے غیر ارادی طور پر اپنا بایاں گال سہلایا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو دبانا شروع کر دیا۔ اس کا دماغ بھی تپ رہا تھا۔ ناانصافی کو دیکھکر دماغوں کا جلنا شاید دونوں کی سانجھی میراث تھی۔

کتاب کا اگلا صفحہ تو اور بھی حوصلہ شکن تھا۔

حوصلہ شکن بھی اور ہتک آمیز بھی۔

کسی سیاسی لیڈر کی موت ہوجانے کے کارن شہر کے تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے تھے۔ بازاروں اور گلیوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے ٹولے اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے سکولوں سے نکل آئے تھے۔ شہر میں ایک ہی کالج تھا اس کے سٹوڈینٹس بھی ہلہ گلہ کرتے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ انورادھا بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ سکول سے نکل آئی تھی۔ انورادھا فطرتاً بڑی کم گو لڑکی تھی اور اس کی سہیلیوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن تھی وہ اچھے نین نقش والی لڑکی اور اس کی شخصیت میں غیر معمولی سی جاذبیت تھی، جس سے دیکھنے والے متاثر ہوتے تھے۔ انورادھا میں بڑا ڈِسپلن تھا۔ یہ چیز

اسے ورثے میں ملی تھی ' اپنے پتا پنڈت امرناتھ سے اور کچھ کچھ
اپنی ماں رُکمنی دیوی سے بھی ۔ وہ سکول جاتے ہوئے اور سکول
سے واپس آتے ہوئے نیچی نظریں کئے اکیلی ہی جاتی آتی تھی۔
اکثر تو اس کا بھائی اشوک بھی اُسے راستے میں مل جاتا تھا'
کیونکہ دونوں کے سکول نزدیک تھے۔ بلکہ صبح سکول جاتے ہوئے
تو دونوں اکٹھے ہوتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی وہ اکیلی بھی چلی
جاتی تھی۔ اکثر تو اُس کا بھائی اشوک بھی اُسے راستے میں مل
جاتا تھا' کیوں کہ دونوں کے سکول نزدیک تھے ۔ بلکہ صبح
سکول جاتے ہوئے تو دونوں اکھٹے ہوتے تھے ۔ لیکن کبھی کبھی
وہ اکیلی بھی چلی جاتی تھی ۔

آج سکول جلدی بند ہوجانے سے انورادھا اور اشوک
الگ الگ ہی گھر جارہے تھے۔ جب وہ دونوں راستے میں مِلے تو
بات بہت بڑھ چکی تھی۔ کالج کے تین لڑکوں نے انورادھا کو
اکیلی پا کر راستے میں گھیر لیا تھا اور اُس سے گندے گندے
مذاق کرنے لگے تھے ۔ انورادھا کے لئے یہ سانحہ ایک دم نیا تھا۔
اب تک کسی لڑکے نے اسے چھیڑنے کی ہمت نہ کی تھی۔
انورادھا اپنے آپ کو بالکل بے بس اور مجبور سمجھنے لگی تھی اور اُس

کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے ۔ وہ غیر ارادی طور پر زور سے چیخی اور اُس نے دیکھا اُسی لمحہ اشوک وہاں پہنچ گیا تھا ۔ تھا تو وہ کمزور سا لڑکا اور اُن لڑکوں کے مقابلے میں اس کی عمر بھی کم تھی ۔ لیکن اس نے اپنی کتابوں کا بستہ ایک طرف پھینک کر اُن لڑکوں میں سے ایک کو گردن سے پکڑ لیا ۔ اس پر دوسرے دونوں لڑکے اس پر جھپٹ پڑے اور اسے ماں بہن کی گالیاں دیتے ہوئے بُری طرح پیٹتے رہے ۔ انورادھا نے جب یہ دیکھا تو وہ اشوک کو بچانے کے لئے ' ان لڑکوں سے گتھم گتھا ہو گئی ۔ اشوک کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور اسے بہت چوٹیں بھی آئی تھیں ۔ اُدھر سے گزرتے ہوئے کچھ لوگوں نے ان لڑکوں کی پٹائی کی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے ۔ انورادھا اور اشوک جب گھر پہنچے تو دونوں کا بُرا حال تھا۔

اس سے اگلے دن محلے کے لوگوں نے دیکھا' کہ اُن کے کپڑے سینے والی بیوہ عورت اپنے بچوّں کے ساتھ وہ محلہ چھوڑ رہی تھی ۔ اس کا سامان ایک چھکڑے پر لدا تھا اور وہ چھوٹا سا کُنبہ ،جس کے بارے میں کسی کو کوئی شکایت نہ تھی' اُس محلے سے ہجرت کر رہا تھا۔ ایک نا معلوم خوف نے اُن سے اُن کا چین اور

آرام چھین لیا تھا اور ایک بے نام ڈر نے ان کے دل و دماغ میں تحلیل ہو کر انہیں ایک دم بے دست و پا کر ڈالا تھا۔ ہجرت کے دوران ہر مہاجر کو اس کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انورادھا پر خوف کا یہ دوسرا حملہ تھا۔

پہلا حملہ تو اُس پر اُس وقت ہوا تھا' جب اس کے پتا کی لاش گھر کے کچے فرش پر پڑی تھی اور اس کے سرہانے آٹے کا دِیا جل رہا تھا۔ اور اس کے پاس ہی گنگا جل کی اوندھی پڑی بوتل سے گنگا کا پَوِتر جل بُوند بُوند نکل کر فرش کی کچی مٹی میں رچتا جا رہا تھا۔

شاید اسی لئے انورادھا کو ہمیشہ یہ خیال پریشان کرتا رہتا تھا کہ وہ ایکدم اکیلی اور غیر محفوظ تھی اور کسی بھی لمحہ اُس پر حملہ ہو سکتا تھا۔ غیر محفوظ ہونے کا یہ احساس انورادھا کے لئے بڑا اذیت ناک تھا۔ یہ تو اب پچھلے کچھ سالوں سے اُس میں آتم وشواش اُبھرنے لگا تھا اور وہ اپنے آپ کو محفوظ اور خطروں سے دُور سمجھنے لگی تھی۔ اُس میں یہ احساس جگانے کی ذمہ داری کسی حد تک کوشل کی بھی تھی۔ جب سے وہ اس کی زندگی میں آیا تھا' زندگی کے بارے اس کا کونسیپٹ ہی بدل گیا تھا۔

اب اسے زندگی اتنی ناقابل اعتبار اور بے مروت نہیں لگتی تھی۔ کوشل نے جیسے اس کی شخصیت پر پڑا پُرانا خول اُتار دیا تھا۔ اور اس کی جگہ اسے نیا، خوشنما اور خوش رنگ لبادہ دے دیا تھا۔ اب انورادھا کو زندگی جینے کے قابل لگنے لگی تھی۔

لیکن اس سمے جب اُسے کوشل کی بے حد ضرورت تھی، وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ کب واپس آئے گا، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ کیوں کہ کوشل کی پرانی ہسٹری کچھ اِسی طرح کی تھی۔ اور وہ اپنی ہسٹری کو نئے انداز سے لکھنے کا قائل بھی نہیں تھا۔ حالانکہ اب بہت سے ملکوں کی سرکاروں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کی تاریخیں نئے سِرے سے لکھیں اور اپنی پُرانی تاریخوں کو بھول جائیں۔

لیکن ماضی کو بھولنا اتنا آسان نہیں۔

بستر میں لیٹے لیٹے انورادھا کو لگا جیسے وہ کئی صدیوں سے، دنیا بھر کے جزیروں سے کٹی۔ ایک بے آباد جزیرے میں اکیلی پڑی تھی۔ جیسے وہ زندگی کی مین سٹریم سے ایکدم الگ ہو گئی تھی اور اب ایک چھوٹی سی آب جُو کی طرح دُھوپ کی تپش سے سُوکھتی جارہی تھی۔ وہ ایک ایسی آب جُو تھی جو نہ تو

سمندر سے ہمکنار ہوسکی تھی اور نہ ہی بے کنار ہوسکی تھی۔
وہ صرف اپنے وجود میں سمٹ گئی تھی۔
اور اب مزید سمٹتی جارہی تھی۔
آخر وہ کہاں تک سمٹتی جائے گی۔
سمٹنے کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے آخر!
یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے آپ کو بستر پر پوری طرح پھیلا دیا۔ اپنے بازوؤں کو اوپر کھینچا۔ کئی بار لمبے لمبے سانس لئے اور اپنے آپ کو یہ احساس دلایا کہ باوجود اس کے، کہ زندگی کے طویل سفر میں جہاں لوگ بچھڑتے ہیں، منظر بدلتے ہیں اور رشتے بنتے بگڑتے ہیں ہمیں ہر دم اُس سفر کیلئے تیار رہنا چاہیے جو ہم سب کا مقدر ہے۔ اور اس سفر پر گامزن ہونے کے لئے اپنے آپ میں پورا، اعتماد رکھنا چاہئے اور گریس رکھنی چاہئے۔ کمزوروں اور بزدلوں کی طرح گلے میں خوف وہراس کا طوق ڈال کر اپنے سفر کا آغاز نہیں کرنا چاہئے
جانے کیوں انورادھا کو اس لمحہ ٹامس مُور کی یہ لائینز یاد آگئیں اور وہ دیر تک اُنہیں اونچی آواز میں دہراتی رہی، جیسے کوئی بھولا ہوا سبق یاد کر رہی ہو۔

Oft, in the stilly night,
Ere slumber`s chain has bound
me.
Fond memory brings the light
of other days around me !
The smiles, the tears
of Boyhood`s years.
The words of love then spoken.
The eyes that shone,
Now dimm`d and gone,
The cheerful hearts now
broken!
Thus, in the stilly night,
Ere slumber`s chain has
bound me.
Sad memory brings the light
of other days around me.
When I remember all
the friends, so link`d together,
I`ve seen around me fall
Like leaves in wintry weather.
I feel like one
Who treads alone,
Some banquet-hall deserted,
Whose lights are fled,
Whose garlands dead,
And all but he departed !
Thus, in the stilly night,
Ere slumber`s chain has bound
me.
Sad Memory brings the light
of other days around me.



ٹامس مُور کی ان لائینز کوبار بار پڑھنے کے بعد اُسے اُن لوگوں کی یاد آئی جو سمے سمے پر زندگی کے طویل اور دشوار سفر کے دوران اُس سے الگ ہوتے رہے تھے۔ اس پُردرد پروسیس کی ابتدا تو اُس کے پتا سے ہوئی تھی، جس کے بارے میں وہ صبح سے سوچ رہی تھی اور جس کی موت نے اُس کی ابتدائی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جو اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی پُر نہ ہو سکا تھا۔

پھر اُسے ستونت کی یاد آئی جو کالج میں اُس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ ستونت اس کا دوست تھا لیکن اس سے زیادہ انورادھا کو اس کی ماں پسند تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے کاتے ہوئے سُوت سے بنے کھدر کی شلوار قمیص پہنتی تھی اور اس لباس میں بڑی پروقار لگتی تھی۔ وہ گروگرنتھ صاحب کی بانی اتنی شدھ اور پراثر آواز میں پڑھتی تھی کہ سننے والوں کا سر خود بخود عقیدت سے جھک جاتا تھا۔ اتوار کے دن وہ دیسی گھی کا کڑاہ پرشاد بناتی تھی اور اس میں اپنی شردھا، خلوص اور عقیدت کی اتنی زیادہ چاشنی ڈالتی تھی

کہ جی کرتا تھا کہ پرشاد کی مقدار اور بھی زیادہ ہو' تا کہ اس کا سیون دیر تک کیا جاسکے ۔ انورادھا کبھی کبھی کسی اتوار کو ستونت کے اصرار پر اس کے گھر بھی چلی جاتی تھی اور اپنے لئے پرشاد کے ساتھ اپنی ماں اور بھائی کے لئے بھی چاندی کی بڑی سی کٹوری میں ڈھیر سارا کڑاہ پرشاد کھدر کے رومال سے ڈھک کر لاتی تھی اور اپنا حصہ ستونت کے گھر میں کھا چکنے کے بعد اپنے گھر میں بھی کافی حصہ لے لیتی تھی۔ اس کی ماں بھی ستونت کی ماں سے پانچ سات بار مل چکی تھی اور دونوں کا آپس میں سہیل پنا بھی ہو گیا تھا اشوک کی عمر اگرچہ کم تھی لیکن ان سے بھی ایک جذباتی لگاؤ قائم ہو گیا تھا ۔ ستونت کی ایک بڑی بہن بھی تھی جس کی شادی ہو چکی تھی ۔ اس کے سسرال والے لدھیانہ میں رہتے تھے ۔ اور ان کا سپیر پارٹس کا بیوپار تھا ۔ وہ لوگ خوش حال تھے ۔ستونت کے پتا کا کپڑے کا کام تھا۔ وہ اس کام کو پھیلانا چاہتے تھے اور ستونت کو اپنی تعلیم چھوڑ کر اپنے ساتھ کاروبار میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ستونت کو دو کان داری پسند نہیں تھی ۔ وہ اپنی تعلیم پوری کر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ کر سِول سروس میں آنا چاہتا تھا ۔ یہی آرزو انورادھا کی

بھی تھی۔باپ اور بیٹے کے نظریات میں بہت بڑا ٹکراؤ تھا۔ البتہ
اسکی ماں بڑے سادہ خیالات کی مالک تھی اور اس کے پتا گاندھی
جی کے پیرو کاروں میں رہے تھے اور سنہ ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان
چھوڑو" کی تحریک میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ گاندھی جی
کے ساتھ ان کی تصویر بھی ٹنگی تھی، ستونت کی ماں کے کمرے
میں۔ ماں، باپ بیٹے کے باہمی اختلافات سے دُکھی تھی۔ وہ
ستونت کے پتا کو سمجھانے کی کوشش کرتی تھی لیکن ان کا
صرف ایک ہی جواب تھا۔ ان کے بعد اتنا بڑا کاروبار، اتنا بڑا لین
دین اور وہ ساری جائیداد کون سنبھالے گا؟ ستونت پر تو انہیں
بالکل بھروسہ نہیں تھا۔ماں بلکہ کبھی کبھی مذاق میں کہہ دیتی
تھی کہ اگر اُن کے بس میں تھا تو ایک اور بیٹا پیدا کر لیں۔
پندرہ بیس برس مین تو وہ جوان ہو ہی جائے گا۔

"تو تم ستونت کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں؟ اس کا
بیٹا جوان ہو کر سارا کام سنبھال لے گا۔"

"آپ کر لیجئے بات ستونت سے۔"

لیکن باپ بیٹے کے درمیان اتنا کمیونیکیشن گیپ تھا کہ ان کی
آپس میں گفتگو ہی کب ہوتی تھی۔بلکہ ان دونوں کے درمیان تو

کولڈوار والی کیفیت تھی ۔ بے چاری ماں کا رول تو بس ایک ثالثی قسم کا رول رہ گیا تھا ۔ بیٹے سے زیادہ ضدی تو باپ تھا۔ وہ تو صلح میں یقین رکھتا ہی نہیں تھا ۔ گھر میں وہ ہونا چاہئے جو وہ چاہے ۔ماں مہاتما گاندھی کی چیلی اور اہنسا میں کڑوشواس رکھنے والی خاتون ۔ وہ گھر کے امن کو برقرار رکھنے لئے ہر ممکن کوشش کرتی لیکن کبھی کبھی ناامید اور دل برداشتہ ہوجاتی۔

ادھر انورادھا کا زیادہ آنا جانا بھی ستونت کے پتا کو پسند نہیں تھا۔

"تم اس لڑکی کو اپنے گھر کیوں لاتے ہو ؟" انہوں نے ستونت سے ایک دن پوچھ ہی لیا

"میری دوست ہے اس لئے ۔"

"تو میں تمھارا دشمن ہوں ؟"

"آپ بہتر جانتے ہیں ۔"

"اس لڑکی کا ادھر آنا بند کر دو ۔"

"ڈیڈی آپ میری بات کو سمجھئے ۔ وہ میری دوست ہے۔ ممی کو کوئی اعتراض نہیں ہے اس کے آنے پر ۔"

"یہ گھر میرا ہے تمھاری ماں کا نہیں ۔"

"گھر تو دونوں کا ہے ڈیڈی۔"

"یہ گھر صرف میرا ہے اور اس کا مالک صرف میں ہوں"

"اور میرا کیا رول ہے اس میں؟"

"بالکل کوئی نہیں۔ پڑھائی چھوڑ کر کاروبار میں شامل ہو جاؤ۔ پھر تمھارے رول کا فیصلہ ہو گا۔"

"یہ مجھے منظور نہیں۔"

"تو میں تمھیں اپنی جائیداد سے الگ کر دونگا۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"پھر تم بھوکے مروگے اور گاندھی کی چیلی اپنی ماں سے سفارش کراؤگے۔"

"ہرگز نہیں کراؤں گا۔"

"یہ لڑکی اب ہمارے گھر نہیں آئے گی۔"

"میں اُس سے شادی کر کے اُسے اِس گھر میں لاؤں گا"

"تم اُلّو کے پٹھے ہو۔"

"مجھے اس پر شک ہے۔"

"دفع ہو جاؤ۔ ہٹ جاؤ میری نظروں سے۔" ستونت کے پتا نے کڑک کر کہا

اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور ستونت کمرے سے باہر نکل گیا ۔اور تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر سے بھی چلا گیا۔ آوارہ اور بے مقصد گھومتا رہا ۔اس کے باپ نے ستونت کی شادی کا پروپوزل نامنظور کر دیا تھا۔ اگر اس کی بات کو اس بے دردی سے نہ ٹھکرایا جاتا تو باپ اور بیٹے میں کسی نہ کسی لیول پر سمجھوتہ ہو سکتا تھا ۔ ستونت کو اس کا بہت دُکھ تھا۔

اگلے دن ستونت جب کالج میں انورادھا سے ملا تو اس نے انورادھا سے کہا کہ وہ کالج کے بعد اس سے ضرور ملے ۔اُسے کوئی نہایت ہی ضروری بات کرنا تھی۔

جب دونوں ملے تو ستونت نے بغیر کسی تمہید کے اپنی بات شروع کر دی

"کل ڈیڈی سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا ۔"

"کیوں ؟"

وہ مجھے پڑھائی چھوڑ کر کاروبار میں شریک ہونے کے لئے کہہ رہے تھے ۔"

"تم نے کیا جواب دیا ؟"

"میں نے ایسا کرنے سے اِنکار کر دیا"۔

"پھر؟"۔

"پھر اُنھوں نے کہا کہ اس لڑکی کا گھر میں آنا بند کردُوں"۔

"کس لڑکی کا؟"۔

"جس سے میں اِس وقت بات کر رہا ہوں"۔

"اس کا تُم نے کیا جواب دِیا؟"۔

"میں نے کہا میں اس سے شادی کر کے اُسے اس گھر میں لے آوں گا۔"

"اُنہوں نے کیا کہا؟"

"کہا کہ تُم اُلّو کے پٹھّے ہو۔"

"پھر؟"

"میں نے کہا کہ مجھے اس میں شک ہے۔"

"وہ کیا بولے۔"

"اُنہوں نے مجھے گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی ۔"

"اور تم گھر سے نکل آئے اور آوارہ گھومتے رہے؟"

"ہاں۔"

"اور اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں تم سے کورٹ میرج کر کے اس شہر کو چھوڑ دینا چاہتا ہوں ۔"

"مجھے تمھاری یہ بات منظور نہیں ۔"

"کیوں ؟"

"میری شادی کا فیصلہ میری ماں کرے گی ۔میں نہیں"

"تو تم اپنی ماں سے پوچھ لو ۔"

"میری کچھ ذمہ داریاں ہیں ۔میں ابھی ماں سے شادی کی بات نہیں کر سکتی ۔"

"تو میں تمھاری ماں سے پوچھ لوں ؟"

"نہیں، ابھی وہ اس کے لئے حامی نہیں بھرے گی ۔"

"تو میں کیا کروں ؟"

"اپنی پڑھائی ختم کرو اور مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھو ۔"

"اور تم کیا کرو گی ۔؟"

"میں اُس وقت کا انتظار کروں گی ۔"

"میں انتظار نہیں کر سکتا ۔میرے سامنے ایک چیلینج ہے اور مجھے اس کا مقابلہ کرنا ہے ۔"

"چلینج میرے سامنے بھی ہیں ستونت ۔ مجھے بھی اُن کا مقابلہ کرنا ہے ۔"

"میرے ساتھ اسی وقت چل پڑو ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا ۔"

میں خاموش رہی تو وہ بولا

"اپنی شادی کا فیصلہ ہمیں خود کرنا چاہئے ہمارے ماں باپ کو نہیں ۔ اب زمانہ بہت بدل گیا ہے ۔"

"میرے لئے ابھی وہ ایک ہی جگہ پر رُکا ہوا ہے ستونت۔ لمحے حرکت نہیں کر رہے ۔ مجھے ابھی ٹھیک لمحے کا انتظار ہے ۔ تم بھی کچھ دیر اور انتظار کرو ستونت ۔"

"میں نہیں کر سکتا ۔"

یہ جواب دیتے ہوئے اُس نے مجھے بازوؤں میں لے کر چُوم لیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا آگے نکل گیا ۔ جیسے کبھی کبھی وقت ہمیں چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے ۔

ہم ایک ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں لوگوں کی آمدورفت نہیں تھی ۔ اِس لئے کسی نے نہیں دیکھا تھا کہ ایک لڑکے نے کِسی لڑکی کو بیچ رستے میں چُوم لیا تھا اور پھر اُسے اکیلی

چھوڑ کر ایک طرف نکل گیا تھا۔

اس دن جب انورادھا گھر پہنچی تو بڑی بے حال تھی۔

انورادھا اور اس کی ماں کی آپس میں بڑی گہری انڈر سٹینڈنگ تھی۔ اس نے اپنی ماں سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ رکمنی دیوی کو معلوم تھا کہ انورادھا ستونت کے گھر جاتی تھی اور وہ دونوں دوست تھے۔ لیکن آج کے واقعہ کے بارے میں اس نے اپنی ماں سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ ستونت سے ہوئی گفتگو کو اپنے ذہن میں دہراتی رہی اور اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ رات وہ ٹھیک طرح سو بھی نہ سکی۔ اُسے تمام رات لگتا رہا کہ ستونت اسے بار بار جھنجھوڑ رہا تھا اور اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایک دفعہ تو اُسے ایسا بھی لگا کہ اُس نے انورادھا کو بستر سے اُٹھا کر اپنے ساتھ کھڑا بھی کر لیا تھا اور کہا تھا ــــ دیکھو رستہ کتنا صاف ہے اور موسم کتنا دلکش ہے۔ آؤ سفر پر نکل چلیں۔ سفر ایسے ہی موسموں میں طے کئے جاتے ہیں ــــ انورادھا کی نیند ٹوٹ گئی۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے چار بجے تھے۔ اُس نے بستر سے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی۔ ماحول میں گہری

خاموشی تھی ۔ موسم بڑا دلکش تھا ۔ آسمان میں تارے بھی ٹمٹما رہے تھے۔ اسے لگا ستونت اکیلا ہی سفر پر نکل گیا تھا ۔ لمبے سفروں کا آغاز تو ایسے ہی موسموں میں کیا جاتا ہے ۔ طویل سفروں کے لئے تو یہی کھشن شبھ مانے جاتے ہیں۔

لیکن انورادھا کے لئے یہ کھشن شبھ ثابت نہیں ہوا۔

آج پورنماشی تھی اور وہ ہر پورنماشی کو برت رکھتی تھی کیوں کہ اس کی ماں بھی یہ برت رکھتی تھی ۔

وہ جلدی تیار ہو گئی ۔ پورنماشی کی کتھا بھی اس نے ماں کو سنائی تھی لیکن کتھا سناتے سمے اسے کئی بار ایسا لگا تھا کہ ستونت اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ چلنے پر اصرار کر رہا تھا ۔ کتھا کے دوران کئی بار انورادھا کا دھیان ٹوٹا ۔ دو ایک بار تو اس کی ماں نے اسے ٹوکا بھی ۔۔ کہاں ہے تیرا دھیان آج ۔ کتھا بھی ٹھیک سے نہیں سنا رہی ہو۔

انورادھا بنا کوئی جواب دیئے ستونت سے بار بار اپنا ہاتھ چھڑاتی رہی اور پستک سے پورنماشی کی کتھا اُچارتی رہی ۔

اشوک جب بیڈ ٹی پی رہا تھا انورادھا اس سمے کالج جانے کو تیار تھی ۔

انورادھا جب کالج پہنچی تو کہرام مچا ہوا تھا۔ستونت نے رات زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی ۔انورادھا پر جیسے فالج گر گیا ہو۔ وہ کسی نہ کسی طرح واپس گھر پہنچ گئی اور ماں سے ستونت کی موت کا ذِکر کیا اور خود پچھاڑیں کھا کر روتی رہی۔

رُکمنی دیوی ہی ستونت کے گھر گئی تھی ۔ سارا شہر اکٹھا ہو رہا تھا ۔پولیس ستونت کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئی تھی۔

ستونت نے مرنے سے پہلے کچھ بھی تو لکھ کر نہیں چھوڑا تھا ۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے خود کشی کیوں کی تھی ۔

"ستونت کی خود کشی کے صرف دو گواہ تھے ۔"

"کپڑے کے کاروبار کے مالک اُس کے پتا"

"اور انورادھا' اس کی دوست"

اور دونوں گواہ خاموش تھے ۔عدالت کچھا کھچ بھری تھی لیکن مجرم کون تھا' اس کا ثبوت عدالت کو نہیں مل رہا تھا۔

شمشان میں جب ستونت کی چتا جل رہی تھی ۔اس وقت انورادھا گھر میں اکیلی تھی اور اس نے اپنے سینے میں بھی ایک

ایسی ہی چتا جلائی تھی جس کے شعلے کسی کو نظر نہیں آرہے
تھے، وہ صرف انورادھا ہی کو اُس کی روح تک جلائے جارہے
تھے۔ ستونت کی چتا کے شعلوں کو دیکھنے کے لئے تو سارا شہر
موجود تھا۔ دیکھنے والوں میں رُکمنی دیوی بھی تھی اور اشوک
بھی۔ لیکن انورادھا کے سینے میں جلنے والی چتا کو دیکھنے والا کوئی
نہیں تھا۔ خود انورادھا بھی نہیں۔

ستونت کی موت کے بعد انورادھا کبھی اس کے گھر
نہیں گئی۔ اس کے گھر سے ساری وابستگیاں اس کے ساتھ ہی
ختم ہو گئی تھیں۔

انورادھا نے اپنے سینے میں جو چتا جلائی تھی اس پر اس
نے پانی کی ایک بوند بھی نہ چھڑکی تھی۔ بارش کا کوئی قطرہ
بھی نہ کبھی پڑا اُس پر اُس کی تپش کو کم کرنے کے لئے۔ وہ
اس تپش سے اندر ہی اندر جلتی رہی اور کسی کو بھی اس جلن
میں شریک نہ کیا۔

ستونت کی موت کے بعد اس نے دلکش موسموں میں
بھی کسی طویل سفر کا آغاز کرنے کی آرزو نہ کی۔

سفر کی آرزو، پہلے سنگ میل کے آنے سے بھی پہلے

ہی مر گئی تھی۔

انورادھا ٹامس مُور کی لائنیز پڑھنے کے بعد یادداشت میں قید جن لمحوں سے اس وقت گزر رہی تھی وہ لمحے بڑے کربناک تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ تکیئے میں منہ چھپا کر اس بے دردی سے چیخی کہ اس کے جسم کا انگ انگ تھر تھرا اٹھا۔

اچانک انورادھا کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں رُکمنی دیوی کا پژمردہ اور نڈھال چہرہ ایک ہی جگہ جم کر ٹھہر گیا۔

زندگی کے طویل سفر میں بچھڑا ہوا' ایک اور مسافر' جو صرف مسافر ہی نہیں تھا۔ اس قافلے کا سالار بھی تھا' جس میں انورادھا شریک تھی۔

عین اسی لمحہ کال بیل گونجی۔

انورادھا ایکدم گھبرا گئی۔ اس وقت تو کسی سے بھی ملنے کی حالت میں نہیں تھی وہ۔ اِس بُرے حال میں وہ کس سے ملے گی؟

وہ ابھی بستر سے اٹھی ہی تھی کہ بیل دوسری بار گونجی۔

وہ جُھنجھلا کر دروازہ کھولنے کیلئے گئی۔
دروازہ کھولا تو سامنے کوشل کھڑا تھا۔ اپنی تمام جاذبیت
اور دلکشی کے ساتھ۔ جیسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن۔

۵

"کیا تُم ہمیشہ ہی ایسا کرتے رہو گے کہ جب مجھے تمھاری ضرورت ہو تم غائب ہو جاؤ؟"

انورادھا نے کوشل کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا، انورادھا۔"

"تو کہاں چلے گئے تھے تم؟" انورادھا کوشل کے ساتھ چمٹ گئی

"تمہیں بتا کر تو گیا تھا۔"

"کب پہنچے ہو؟"

"اسٹیشن سے سیدھا یہیں آرہا ہوں۔ گھر بھی نہیں گیا۔"

"سامان کہاں ہے تمھارا؟"

"دروازے کے باہر پڑا ہے۔"

"تم کیسے مسافر ہو کوشل، اپنا سامان بھی ساتھ نہیں رکھتے۔"

"ساتھ ہی تو رکھتا ہوں۔" اس نے انورادھا کو اپنی باہوں میں بھینچ کر زور سے چوم لیا۔ اس نے دیکھا انورادھا کی

آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

انورادھا نے ساڑھی کے پلو سے اپنی گیلی آنکھیں پونچھی اور دروازہ کھول کر کوشل کا چھوٹا سا اٹیچی کیس اندر لے آئی۔

"اتنا کم سامان رکھتے ہو اپنے ساتھ؟"

"کھو جائے تو زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔"

"زندگی میں کہیں کچھ بھی کھو جائے تو بہت دکھ ہوتا ہے۔" انورادھا اس کا بازو تھامے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

کوشل نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کتنا تجربہ ہے اس کا؟"

"میرے تجربے کی پوچھتے ہو تم؟ میں نے تو زندگی بھر کھویا ہے۔ پایا کہاں ہے کچھ؟ تمھارے آنے سے پہلے تو میں یہی حساب کر رہی تھی۔ زندگی کے سفر میں کون کون بچھڑا ہے مجھ سے۔" انورادھا صوفے پر بیٹھے کوشل کے سامنے کھڑی تھی۔ لگتا تھا، اس کی نظریں اب بھی انہی رستوں پر جمی تھیں جن کا جائزہ وہ لیتی رہی تھی۔ ایک بار پھر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا، اس کی ماں کا پژمردہ اور نڈھال چہرہ۔ انورادھا

کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے

"کیا بات ہے ۔بتاؤ تو کچھ ؟" کوشل نے صوفے سے اٹھ کر دوبارہ انورادھا کو اپنے بازؤں میں لے لیا۔

انورادھا بڑی آہستگی سے کوشل کے بازؤں سے نکلی اور بیڈروم سے اشوک کا تار اٹھالائی اور اسے کوشل کے ہاتھ میں دے دیا۔

کوشل نے تار کو پڑھا اور چیخا

"وٹ ڈو یو مین "!

"آل از فنیشڈ۔" انورادھا یہ کہتے ہوئے پھپک پڑی ۔اتنی دیر کا دبا ہوا طوفان ایکدم پھر اٹھا تھا۔اس نے اپنے آپ کو صوفے پر گرا دیا کوشل نے اسے اپنے آغوش میں لے لیا اور انورادھا کے امڈتے ہوئے بے پناہ آنسو اُس کی قمیض کو بگھوتے رہے

"اشوک بڑا جذباتی لڑکا ہے ۔وہ اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکے گا" اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں، اس کے چہرے پر جھکی کوشل کی آنکھوں پر گاڑ دیں ۔

"آئی کین انڈرسٹینڈ دیٹ ۔"

دن بھر روتی اور تڑپتی انورادھا نے کچھ دیر کے بعد اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے باتھ رُوم میں جا کر ہاتھ منھ دھوئے۔ دانتوں میں برش بھی کیا کہ کوشل کو ٹوتھ پیسٹ سے صاف دانت پسند تھے۔ انورادھا نے تو کچھ عرصہ سے ٹوتھ پیسٹ بھی وہی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا جو کوشل کو پسند تھا۔ کئی بار اسے لگتا تھا کہ ایک ان جانے انداز سے کوشل کی پسند اور ناپسند انورادھا کی بھی پسند اور نا پسند بنتی جا رہی تھی۔ لیکن اپنی شخصیت پر کوشل کی شخصیت کی اِن جمتی ہوئی چھاپ کا اُسے رنج نہیں تھا۔

"صرف پانچ منٹ رُکو میں میز پر چائے لگاتی ہوں۔" یہ کہہ کر انورادھا کچن میں چلی گئی۔

لمحہ بھر انتظار کرنے کے بعد کوشل بھی وہیں آگیا

"میں دیکھنے آیا ہوں کہ تُم چائے کیسے بناتی ہو۔"

"پہلی بار پی رہے ہو کیا میرے ہاتھ کی چائے؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ تمھارے ساتھ کھڑا رہنا چاہتا ہوں کچھ لمحے، انورادھا۔"

انورادھا بڑے دلکش انداز سے مسکرائی اور پھر اُس نے

کوشل کے گال کو آہستہ سے چُوم لیا۔" کبھی کبھی سوچتی ہوں اگر تم بھی مجھ سے جُدا ہو گئے تو پھر کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہو گا ڈیر ۔ صرف ایک بے کار آدمی تمھاری زندگی سے نکل جائے گا۔"

"تم جانتے ہو، جب تُم دو دن کے لئے بھی چنڈی گڑھ سے باہر جاتے ہو تو میری کیا حالت ہوتی ہے۔"

"جانتا ہوں دن میں کئی بار ٹیلی فون کرتی ہو۔"

"تم تو کبھی نہیں کرتے ٹیلی فون ۔ چاہے کئی روز کے لئے باہر جاؤ۔"

"میں بغیر ٹیلی فون کے ہی تم سے بات کرلیا کرتا ہوں"۔

"مجھ سے نہیں، اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہو۔ اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے ہو۔"

"کتنا لُطف ہے خود سے ہم کلامی میں، اس کا تجربہ ہے تمہیں؟"

"مجھے خود کلامی کے درد کا تجربہ ہے ۔ ایکدم جان لے لینے والا پروسیس ہوتا ہے کوشل۔" انورادھا کیتلی میں چائے کا

پانی بھی ڈال رہی تھی اور بات بھی کرتی جارہی تھی ۔ابلتا ہوا پانی کیتلی سے باہر بھی گر گیا تھا کچھ۔

"یہ بھی خود کلامی ہی کا ایک انداز ہے ۔"

"اُبلتے ہوئے پانی کا چائے کی کیتلی سے باہر نکلنا؟"

"ہاں اُبلتا ہوا پانی اپنے آپ سے ہم کلام ہو رہا ہے ۔"

"بڑی اُلجھی ہوئی باتیں کرتے ہو تم ۔"

"آئی ایم اے کنفیوزڈ ڈرٹی مین ۔"

"میں جانتی ہوں ۔"

پھر دونوں میز کے ساتھ لگی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پینے لگے ۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انورادھا بولی ۔

"تم کیا کرتے رہے دہلی میں؟"

"دہلی میں رہا ہی کہاں تھا؟ پہلے میرٹھ چلا گیا، پھر لکھنئو ۔ دہلی میں تو تھوڑی دیر ہی رکا تھا ۔ اصل میں بزنس میرے بس کی بات نہیں ۔"

"پھر بھی کرتے بزنس ہی ہو ۔"

"اور اکثر نقصان اٹھاتا ہوں ۔"

"سب ستاروں کی باتیں ہیں، کوشل ۔"

"تُم بھی ستاروں مین یقین کرنے لگ گئی ہو؟"

"اب تو تمہارے ہر نظرئیے کو ماننے لگی ہوں ۔ وقت نے مجھے اتنے چھلاوے دئیے ہیں کہ اب مجھے حقیقت پر بھی جھوٹ اور فریب کا گمان ہونے لگتا ہے ۔"

کوشل نے چائے کا ایک لمبا سِپ لیتے ہوئے کہا

"اور مجھے ہر جھوٹ پر سچائی کا ۔"

"یہ بھی تمہارا ایک انداز ہے ۔ جو بات دوسرا فریق کہے اسکو فوراً کاٹ دو ۔ یہ بھی احساسِ برتری کا ایک ڈھنگ ہے ۔"

انورادھا کی بات سن کر کوشل خوب کُھل کر ہنسا اور احمد ندیم قاسمی کا ایک شعر پڑھا

نہ میرے پاس ستارے نہ میرے پاس چراغ
وہ میرے ساتھ سفر اختیار کیوں کرتے

"کچھ لوگ ایسے ہی مسافروں کے ساتھ سفر اختیار کرتے ہیں کوشل ۔ یہ اُن کی مجبوری ہے ۔ ورنہ ڈاکٹر شانتی' اشوک کا انتخاب کیوں کرتی، جو ایک معمولی گھر کا ایک یتیم لڑکا ہے ۔"

"میں سمجھ گیا تمھاری بات ۔ انورادھا صرف وہی آدمی یتیم نہیں ہوتا جس کے ماں باپ نہ ہوں ۔"

"اور کون ہوتا ہے یتیم ؟" انورادھا نے زرا تیکھے لہجے میں پُوچھا۔

"وہ آدمی جس کے پاس نہ کچھ سوچنے کو ہو نہ کہنے کو۔ جس کے جینے کا نہ کوئی مقصد ہو نہ جواز۔ زندگی سے ایکدم کٹا ہوا اور ایک ایسے جزیرے میں بسا ہوا، جس کے چاروں طرف سمندر ہو اور جزیرے سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ وہ وہیں پیدا ہو اور وہیں مر جائے۔ ان سنگ اینڈ ان ویپٹ۔ اشوک ایسا آدمی نہیں ہے میرے خیال سے۔"

"شاید نہیں ہے۔"

"کبھی اس سے ملاقات ہو گی تو تفصیل سے کہوں گا۔"

"ملاقات تو دسمبر میں ہی ہو رہی تھی۔ شانتی بھی ساتھ آ رہی تھی اُس کے۔ لیکن اب تو سب کچھ ختم ہو گیا۔" انورادھا کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کچھ بھی ختم نہیں ہوتا کبھی۔ زندگی کبھی نہ ختم ہونے والا ایک طویل سفر ہے۔ کچھ مسافر بچھڑ جاتے ہیں۔ کچھ نئے شامل ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک نے اپنا رول ادا کرنا ہے زندگی کے تھیٹر میں۔ رول ختم ہوا اور کردار پردے کے پیچھے

چلا گیا ۔ نیا کردار آیا اپنا رول لے کر ۔ پردے کی اوٹ سے پراپٹنگ ہو رہی ہے ۔ پراپٹنگ غلط ہو گئی تو ایکٹر بے چارا بے قصور مارا گیا ۔ مجھے لگتا ہے ڈاکٹر شانتی کے معاملے میں پراپٹنگ غلط ہوگئی ہے ۔ورنہ ایک ڈاکٹر پلیگ سے کیسے مرسکتی ہے ؟"

"ہاں کچھ اور ہونا چاہئے تھا اس کی موت کا کارن ۔"

"لیکن ایسا نہیں ہوا نورادھا۔ شانتی بے چاری پلیگ ہی کا شکار ہوئی ہے ۔ کارن بے احتیاطی بھی ہو سکتا ہے اور اپنے پروفیشن سے شدید کمٹمینٹ بھی ۔"

انورادھا کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں ۔

"تم میرے ساتھ میرے گھر چلو ۔ وہیں مزید گفتگو بھی کریں گے اور ڈِنر بھی ساتھ ہی لیں گے ۔"

"من نہیں کر رہا ۔"

"من کے خِلاف چلو ۔ کبھی کبھی اس سے بھی کلیان ہوتا ہے ۔"

"کلیان تو خاک ہو گا لیکن چینج ضرور ہو جائے گا ۔ چلتی ہوں تمھارے ساتھ ۔"

"میں تمہیں کچھ ایسے واقعات بھی سُناؤں گا جن کا دہلی

کے اخباروں میں خوب چرچا ہوا ہے ۔ پلیگ کی وبا سے بڑے بڑے عجیب ردّ عمل سامنے آئے ہیں ۔"

کچھ دیر کے بعد انورادھا نے گیرج سے گاڑی نکالی اور کوشل اور وہ مدھیہ مارگ پر آگئے اور کوئی بیس منٹ کے بعد اس لین میں پہنچ گئے جہاں کوشل کا فلیٹ تھا ۔جس کی روشنیاں اس وقت جلیں گی جب کوشل قفل کھول کر اندر داخل ہو گا ۔ دو دن سے تو اس میں اندھیرا ہی تھا۔

٦

فلیٹ کی روشنیاں جل گئیں۔

کوشل کا تین کمروں والا فلیٹ ایک دم جگمگا اٹھا۔

"تمھارا گھر تو تمھاری غیر حاضری میں بھی ویسا ہی سجا سجایا اور خوبصورت رہتا ہے۔"

میں جب گھر سے باہر جاتا ہوں تو کمروں کی دیواروں کو، کھڑکیوں کو، دروازوں کو، اپنی کتابوں اور دیواروں پر لگی تصویروں کو، گھر کی ایک ایک چیز کو یہ کہہ کر جاتا ہوں کہ تمھیں انورادھا کی قسم بس اسی حالت میں رہنا، جس میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"اور سب کچھ اسی حالت رہتا ہے۔"

"ہاں، تم خود ہی دیکھ لو۔"

"دیکھ لیا۔" انورادھا نے ہنستے ہوئے کہا۔ کوشل سے ملنے کے بعد اس کے دماغ کا تناؤ بہت کم ہو گیا تھا۔

"تمھیں رامائن کا ایک ورتانت سناؤں؟"

"سناؤ۔"

"جب رام چندر، سیتا اور لکشمن ' راون کی لنکا پر حملہ کرنے کے لئے پہلے رامیشورم پہنچے تو رام چندر جی نے دیکھا کے ایک گلہری سمندر کے پانی میں اپنے بدن کو اچھی طرح گیلا کرکے باہر آتی تھی اور اپنے آپ کو ساحل کی مٹی سے پوری طرح ڈھانپ کر پھر سمندر کے پانی میں چلی جاتی تھی ۔ اس طرح اس کے جسم سے لپٹی ہوئی ساری مٹی پانی میں گھل جاتی تھی ۔ اس نے جب کئی بار ایسا کیا تو سیتا نے گلہری سے پوچھا ' یہ تم کیا کر رہی ہو؟

گلہری نے جواب دیا ۔ بھگوان رام کے لنکا پر پہنچنے کے لئے پُل بنا رہی ہوں ۔

یہ سُن کر بھگوان رام ہنس دئیے ۔

انہوں نے سمندر میں بڑے بڑے پتھروں پر 'رام' لکھکر انہیں سمندر کے پانی میں دھکیل دیا ۔ پتھر پانی کی سطح پر تیرنے لگے ۔

ڈُوبے نہیں ۔

سیتا اور لکشمن حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے ۔جب بڑے بڑے پتھر جن پر 'رام' لکھا تھا تیرتے ہوئے سمندر کے

پار، راون کی لنکا کے قریب پہنچے تو راون کی پتنی مندودری انہیں دیکھکر حیران رہ گئی ۔ مندودری راون سے بولی ۔
تم بھی بڑے شکتی شالی ہو ۔ اپنی شکتی کا ثبوت دو ۔
کیا تم بھی پتھروں پر اپنا نام لکھ کر انہیں ساگر میں تیرا سکتے ہو ؟

راون نے تین چار بڑے بڑے پتھروں پر اپنا نام لکھ کر انہیں ساگر میں ڈھکیل دیا ۔ پتھر واقعی پانی کی سطح پر تیرنے لگے ۔ ڈوبے نہیں ۔ مندودری کو بڑا آشچریہ ہوا ۔
وہ راون سے بولی ۔
سچ سچ بتاؤ یہ پتھر کیوں نہیں ڈوبے ؟
راون مسکرایا اور بولا
میں نے پتھروں پر اپنا نام لکھکر جب انہیں سمندر میں پھینکا تو ان سے کہا ۔ تمہیں رام کی سوگندھ ڈوبنا نہیں ۔
"ہاؤ گریٹ"
"بس میں بھی تمھارے نام کا فائدہ اٹھاتا ہوں ۔"
"کوشل تمھارے ساتھ رہ کر تو کوئی بھی نہیں ڈوب سکتا ۔ تم بہت بڑے آدمی ہو ۔"

"مسکا لگا رہی ہو؟"

"نہیں، سچ کہہ رہی ہوں۔" اس نے کوشل کو، اپنی بانہوں میں لے کر اُسے چوم لیا۔ "تم میں بڑی مورل سٹرینتھ ہے۔"

"تو چلو اس جھوٹی سچائی کے نام ایک ایک ڈِرنک ہو جائے۔"

ڈرنکس ایک کی جگہ دو ہو گئیں۔ ماحول کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

"فراق گورکھپوری کا کون سا شعر سنایا کرتے ہو تم اس ماحول میں؟"

آئے تھے ہنستے کھیلتے، میخانے میں فراق
جب پی چکے شراب تو سنجیدہ ہو گئے

فراق بہت بڑا شاعر ہے

"لیکن اُس کی پرسنل لائف تو اچھی نہیں تھی۔"

"پرسنل لائف کس کی اچھی ہوتی ہے؟ آل دِی گریٹ مین ہیو بِن سِنرز۔

لیکن وہ پھر بھی گریٹ ہیں۔ ہمیں دوسرں کی ججمینٹ کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

"لیکن ہم کرتے تو پھر بھی ہیں ۔"

"غلط کرتے ہیں ۔"

"اور یہ جو کچھ سُورت میں ہو رہا ہے وہ غلط نہیں ہے کیا؟ حکومت کی یہ غفلت ۔ شہر کی سینی ٹیشن کو سنبھالنے میں کوتاہی ۔ لوگوں کا شہر سے ایک دم بھاگنا ۔ حفاظتی داوؤں کی کمی ۔ ان کا دراُپیوگ ۔ ڈاکٹروں کی لاپرواہی ۔ خود ڈاکٹروں کا شہر چھوڑ کر بھاگنا اور ڈاکٹر شانتی اگروال کی موت ۔"

"دوسری باتوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا ۔ ہر اخبار میں اس کا چرچا ہے ۔

میڈیا کا آجکل ایک ہی موضوع ہے ۔ سُورت اور پلیگ ۔

لیکن ایک بات بہت غلط ہوئی انورادھا ۔" کوشل نے اپنے گلاس میں وِسکی ڈالتے ہوئے کہا

"کونسی بات ؟"

"شانتی اگروال کی موت ۔ موت کے تو اور بھی کئی بہانے ہو سکتے تھے ۔ وہ خود کُشی ہی کر لیتی ۔ پلیگ سے تو نہ مرتی کم بخت ۔ اشوک ذہنی طور پر برباد ہو جائے گا ۔"

"میں بھی یہی سوچتی ہوں ۔ اس کو یہاں آجانے کے

لئے کہہ دوں ؟"

"ہر گز نہیں ۔ میں نے دہلی میں جو کچھ سُنا اور اخباروں میں جو کچھ پڑھا ہے بڑا ہی حوصلہ شکن ہے ۔ میں وہ سبھی اخبار تمھیں دے دونگا پڑھ لینا ۔لیکن کچھ واقعات کا ذکر میں کر بھی دیتا ہوں۔ اشوک کو وہیں رہنے دو اور حالات کا مقابلہ کرنے دو"

"تو تمھارا یہی مشورہ ہے ؟"

"ہاں ۔"

"اور اگر وہ وہاں کے حالات سے ڈرکر یہاں آگیا تو کیا کریں گے ؟"

"اس بات کا فیصلہ اسی وقت کریں گے ۔ اس لمحہ اس مسئلے پر سوچنا بیکار ہے ۔ دہلی کی اخباروں سے جو میں نے جانا ہے وہ یہ ہے کہ پلیگ کی بیماری نے لوگوں کی جانیں تو لی ہیں لیکن سب سے بڑا نقصان اُس نے یہ کیا ہے کہ انسانی رشتوں کو بے حد کمزور کر دیا ہے ۔ لوگ ایک دوسرے سے ڈرنے لگے ہیں ۔ پڑوسیوں نے ایک دوسرے سے ملنا چھوڑ دیا ہے ۔ اگر کوئی آدمی اسپتال میں چیک اپ کے لئے گیا ہے تو اس نے وہاں اپنا نام اور پتہ غلط بتایا ہے ۔ اُسے گمنامی میں مر جانا قبول

ہے، پلیگ کی بدنامی سے نہیں ۔ تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں ۔

"سناؤ ۔"

"دہلی کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے (ویسے یہ ہر بڑے شہر کا ہے) کہ روزی روٹی کے چکر میں بہت سے لوگ اپنے اپنے گاؤں چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں ۔"

"اور یہی پروسیس اب بھی جاری ہے ۔ لوگ دیہات سے اب بھی آ رہے ہیں ۔"

"میں تمھاری بات سے سہمت ہوں ۔ لیکن وہ دہلی رہتے ہوئے بھی اپنے سمبندھیوں سے، یار دوستوں سے، کبھی کبھار ہی ملتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کسی کا کوئی واسطہ نہیں ۔ کچھ سال پہلے جھنجھنو کے گاؤں سے ایک لڑکا اوم پرکاش شرما، ملازمت کے لئے دہلی آ گیا ۔ لیکن یہاں آ کر وہ اپنے لوگوں سے، جو اس سے پہلے یہاں موجود تھے، بہت ہی کم ملا ۔ اس نے لوہا منڈی کی ایک فرم میں نوکری کر لی اور فرم کے دو کیبن والے دفتر میں ہی رات گزارنے لگا ۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے کیوں کہ فرم کے مالک کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ۔ لیکن سورت میں پھیلی پلیگ نے اس کے لئے ایک عجیب پریشانی پیدا

کر دی ۔ اس کے تاؤ کا لڑکا جوگیندر سُورت میں ایک کپڑے کی
دوکان پر نوکری کر رہا تھا۔ وہ دوکان کس بازار میں تھی اور اس کا
کیا نام ہے، اوم پر کاش کو اس کا کوئی علم نہیں ۔ نہ ہی اس
نے کبھی اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کوشش کی۔
پلیگ کی وجہ سے سُورت کے سب بازار بند ہو گئے ۔ ہر طرف
خوف وہراس چھا گیا ۔ لوگ شہر کو چھوڑ کر بھاگنے لگے ۔سب
کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی ۔ جو گیندر بھی شہر چھوڑ کر
جانے والی بھیڑ میں شامل ہو گیا ۔ اس کے پاس اوم پر کاش کا
ایڈرس تھا ۔ وہ دہلی پہونچتے ہی سیدھا اس کے پاس آ گیا ۔ اوم
پر کاش اسے دیکھ کر حیران تو ہوا لیکن اس سے زیادہ پُوچھ تاچھ
نہیں کی ۔ رات وہیں دفتر کے کیبن میں گذارنے کے بعد اگلے
دن وہ صبح سویرے دہلی میں گھومنے کے لئے نکل گیا ۔ شام کو
لوٹا تو اوم پر کاش نے کہا ۔ یار پلیگ کا ہر طرف ہلہ مچا ہوا ہے ۔
تو بھی اپنا چیک اپ کر والے ۔ اگلی صبح وہ اپنے کزن سے جی
ٹی بی اسپتال کا ایڈرس لیکر اکیلا ہی وہاں چلا گیا ۔ کوئی تین بجے
کے قریب اوم پر کاش کو آئی ڈی اسپتال سے جو گیندر کا ٹیلی
فون آیا ۔ تو نے مجھے کہاں پھنسا دیا ہے ۔ اسپتال والوں نے تو

بھی بھرتی کر لیا ہے ۔ اوم پرکاش دیر تک اسے ٹیلی فون پر سمجھاتا بجھاتا رہا ۔ لیکن اگلے دن تو معاملہ ایک دم بگڑ گیا ۔ دوپہر تک میونسپل کارپوریشن کے چار آدمی اوم پرکاش کا پتہ پوچھتے پوچھتے لوہا منڈی میں آگئے ۔ انہوں نے آس پاس کی سب فیکٹریوں میں گولیاں اور کیپسول بانٹ ڈالے ۔ فرم کا مالک اوم پرکاش پر بے حد ناراض ہوا ۔ اوم پرکاش نے فوراً اسپتال کا ٹیلی فون کھٹکھٹایا اور جوگندر کو ڈانٹ پلائی ۔ تو نے راجستھان کے بجائے میری فرم کا ایڈرس کیوں دیا ۔ معلوم ہوا کہ جوگندر نے اس کی فرم کا ایڈرس تو ٹھیک لکھوایا تھا لیکن اپنا نام جوگندر کے بجائے منگت لکھوایا تھا، اسپتال کی ریکارڈ میں ۔"

"لیکن اس نے غلط نام کیوں لکھوایا ؟" انورادھا نے پوچھا۔

"صرف اس لئے کہ اگر وہ صحیح نام لکھواتا تو اگلے دن اس کا نام اخبار میں چھپتا تو اس کے ساتھ اس کی گھر والوں کی بھی بدنامی ہوتی ۔ لوگ اب پلیگ سے زیادہ اپنی بدنامی سے ڈرتے ہیں ۔ میں تمہیں اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز خبر سناتا ہوں ۔"

"تو ڈھیر ساری خبریں اکٹھی کرکے لائے ہو؟"

"تمہیں اخباروں کے تمام کلپنگ دیتا ہوں۔ انہیں پڑھنا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ پلیگ سے ڈر کر لوگ کیسی کیسی حرکتیں کر رہے ہیں۔ اس بیماری نے انسانی رشتوں پر بہت بڑا حملہ کیا ہے۔ سرکار نے ڈاکٹروں کی جو ٹیم سورت میں وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجی اس میں National Institute of Comrmunicable Diseases کے ڈاکٹر ایس جے رحمان بھی شامل تھے۔ وہاں سے رپورٹ بھیجنے کے بعد جب وہ دہلی واپس آئے تو اصول کے مطابق اپنے چیک اپ کے لئے آئی ڈی اسپتال میں گئے۔ لیکن اسپتال کا ماحول اتنا خراب تھا اور حالت اتنی بُری تھی کہ وہ اپنے گھر آگئے اور وہیں اپنا علاج کرانے لگے۔ اسپتال والوں نے ڈاکٹر کو بھگوڑا ڈکلیر کر دیا۔ جس دن سنٹرل گورنمنٹ کے ہیلتھ سیکرٹری نے انہیں گھر پر ہی ان کے اچھے کام کے لئے انہیں مبارک دی، اسی شام پولیس ان کے گھر پہونچ گئی۔ سرکار کے اعلی افسروں کے کہنے پر پولیس نے ان کا پیچھا چھوڑا اور اس کے بعد کچھ افسر خود انہیں دیکھنے کے لئے ان کے مکان پر بھی آئے اور اپنی تسلی

کر کے چلے گئے ۔ اس کے باوجود سریتا وِہار کے پاکٹ ڈی میں ان کے پڑوسیوں پر دہشت چھا گئی ۔ اُسی شام ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔

ڈاکٹر نے خود ہی دروازہ کھولا۔

باہر ایک سردار جی کھڑے تھے ۔ انھوں نے پُوچھا

"ڈاکٹر رحمان ہیں ؟"

"میں ہوں ڈاکٹر رحمان ۔"

"آپ کو پلیگ ہے ؟"

"نہیں دیکھ لیجیے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں ۔"

"ڈی پاکٹ کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو یہاں سے ہٹایا جائے ۔ بہتر ہو گا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

یہ سُن کر ڈاکٹر رحمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ وہ بتیس (۳۲) سال سے اس نوکری میں تھے اور چوہوں کی بیماری کا دہلی میں ان سے بڑا کوئی ایکسپرٹ نہیں تھا ۔ سرکاری سطح پر ان کی اتنی عزت کی جارہی تھی اور خود اُن کے پڑوسی جن سے اُن کا کئی برسوں کا رشتہ تھا آج ان کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتے تھے ۔ وہ ایک دم پھوٹ پڑے اور دروازہ بند کئے بغیر ہی اندر

آ گئے۔

"ذہنی طور پر لوگ اِس قدر گِر سکتے ہیں، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" انورادھا بولی اور اس کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"اب تمہیں کیا بتاؤں کہ دہلی والے کتنے نِرموہی ہو گئے ہیں۔ پلیگ کی بیماری نے ان میں آئی سولیشن کا جذبہ خطرناک طور پر مضبوط کر دیا ہے۔ ہر تیسرے یا چوتھے آدمی نے منہ پر رومال باندھ رکھا ہے۔ بہت سے لوگ تو دفتروں میں بھی منہ پر رومال باندھ کر کام کرتے ہیں۔ بسوں میں بھی سب ایک دوسرے سے ہٹ کر ہی بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بات چیت تو درکنار۔ دہلی تو ویسے بھی یہی سکھاتی ہے کہ ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھو اور کسی پر بھی اعتبار نہ کرو۔ لیکن پلیگ کی بیماری نے دِلوں کے اندھیرے کونوں میں چھُپے اس شک کے جذبے کو، دن کی روشنی میں، بیچ سڑکوں پر کھینچ کر کھڑا کر دیا ہے۔ کوئی کھنکار بھی دے تو لوگ چونک اُٹھتے ہیں۔ خاوند، بیوی اور بچّوں میں بھی پہلی سی بے تکلفی نہیں رہی۔ گھر میں بھی رومال منہ پر باندھ کر بات کرتے ہیں۔

اب تو گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز بھی ایک دوسرے سے ملنے سے ہچکچاتے ہیں ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں دمشق میں اتنا بھیانک قحط پڑا تھا کہ عاشق عشق کرنا بھُول گئے تھے ۔ دہلی کی حالت دیکھ کر تو لگتا ہے کہ دمشق میں ایسا قحط ضرور پڑا ہو گا۔ ڈر اور شک تو انسانی بُنیادی جِبلّتوں کو بھی ختم کر دیتے ہیں ۔"

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم"۔

"آئی ڈی اسپتال کے قریب رہنے والے لوگوں میں تو ایک عجیب سی تبدیلی آئی ہے ۔

یہ اسپتال تین طرف سے کالونیوں سے گھِرا ہوا ہے ۔ کوٹھیوں اور اسپتال کی درمیان کبھی دس ایکڑ کا پارک تھا۔ سرکار کی غفلت اور لوگوں کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ پارک ایکدم جنگل میں بدل گیا' اسپتال کی پیلی عمارت اونچے اونچے پیڑوں کے کارن نظروں سی اوجھل ہونے لگی۔ اب ہُوا یہ کہ لوگ گھروں کے ٹیرس سے ان درختوں کو دیکھتے اور ارد گرد پھیلی ہریالی کا لطف لیتے ۔ لیکن جب ساری دہلی کے پلیگ کے مریض اس اسپتال میں بھرتی کئے جانے لگے تو یہ ہرا بھرا جنگل ڈر اور دہشت کا مرکز بن گیا ۔ لوگ اب گھروں کے ٹیریسوں پر

کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو انگلی کی اشارے سے بتاتے ہیں۔ وہ رہا پلیگ کا وارڈ ۔ وہ وارڈ ہے جہاں مریض آخری سانس لے رہے ہیں ۔"

"میں نے مسئلے کے اس پہلو کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا ۔ تم نے تو ایک نیا ہی ڈائی مینشن پیش کیا ہے ۔"

"پلیگ نہ صرف ہمارے اپنے ہی رشتوں پر اثر انداز ہوئی ہے بلکہ اس نے ہمارے انٹر نیشنل ریلیشنز کو بھی خراب کیا ہے۔

اس کی شروعات اٹھائیس ستمبر کو ہوئیں ۔ بمبئی سے جدّہ جانے والی ایر انڈیا فلائٹ ابھی فضا میں ہی تھی اور اپنی منزل پر پہونچنے والی تھی کہ اچانک ایک پیغام ہوائی جہاز کے کریو کو دیا گیا ۔ پیغام میں کہا گیا کہ ہوائی جہاز کو واپس بمبئی بھیج دیا جائے ۔ اُسے جدّہ میں اُترنے کی اجازت نہیں تھی ۔ وجہ یہ تھی کہ ہوائی جہاز اس علاقے سے آرہا تھا جو پلیگ کی زد میں تھا۔ جدّہ کی حکومت کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی ۔ اسی روز دوپہر کو تری وینڈرم سے مسکت جانے والی فلائٹ کو بھی واپس بھیج دیا گیا۔ اُس کے بعد کویت، قطر، دوبئی، اور

بہرین سے بھی یہی پیغام آیا کہ ہندوستان سے جانے والی اور ان ملکوں سے ہندوستان آنے والی سبھی فلائیٹیں رد کر دی گئی تھیں ۔ جرمنی ، فرانس اور اٹلی نے بھی بڑے زبردست حفاظتی اقدام اُٹھائے اور مسافروں کے ساتھ بڑا توہین آمیز سلوک کیا جانے لگا ۔ پاکستان اور بنگلہ دیش نے بھی اپنی فلائیٹس کینسل کر دیں ۔ لیکن سب سے زیادہ توہین تو روم میں مدر ٹریسا کی ہوئی ۔ مدر ٹریسا ایر انڈیا کی فلائٹ سے روم پہونچ رہی تھیں ۔ جوں ہی وہ ایر پورٹ پر اُتریں انہیں میڈیکل کے لئے بھیج دیا گیا جس میں کئی گھنٹے لگ گئے ۔ بہت دیر بعد مدر ٹریسا کو ماسک پہنے ہوئے ایر پورٹ کا ایک ملازم ویل چیر پر بیٹھا کر ، ایر پورٹ سے باہر لایا ۔ مدر کی حالت اس وقت بے حد خراب تھی ۔"

"دِس اِز ویری ویری انسلٹنگ ۔ " انورادھا نے اپنا خالی گلاس جسے وہ کافی دیر سے ہاتھوں سہلا رہی تھی میز پر رکھتے ہوئے کہا ۔

"بٹ دِس اِز اے فیکٹ ۔ "

"مجھے یہ سب سُن کر شرم آرہی ہے ۔ "

"انورادھا ۔ سورت میں پلیگ کے پہلے کیس کا پتہ لگنے

کے کچھ ہی دنوں کے اندر اندر ہندوستان انٹرنیشنل لیول پہ
مجرم قرار دے دیا گیا تھا ۔حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ بیماری
تو سورت میں شروع ہوئی لیکن اس وقت پلیگ کی سب سے
زیادہ تعداد دہلی میں ہے"۔

رات کو جب کوشل انورادھا کو اس کے گھر چھوڑنے
آیا تو انورادھا بہت ڈی پریسڈ تھی۔ جب وہ کوشل کے ساتھ اس
کے فلیٹ پر گئی تھی تو اس کو یہ امید تھی کہ وہاں جا کر وہ
سنبھل جائے گی ۔ لیکن کوشل نے جو باتیں سُنائی تھیں اُن سے
اس کی ذہنی حالت سنبھلنے کے بجائے اور خراب ہو گئی تھی ۔
جب کوشل نے رخصت ہونے سے پہلے انورادھا کو اپنے بازؤں
میں لے کر اُسے چوما تو اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے انسو
آ گئے ۔

۷

رات کو انورادھا کی حالت بڑی عجیب سی رہی۔
آدھی رات تک تو اُسے نیند نہیں آئی۔ بستر پر پڑی پڑی کروٹیں بدلتی رہی اور اُوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہی۔ وہ جو پروبیشن لگ بھگ پچھلے دو دن سے چل رہا تھا، وہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ جیسے وہ ایک اکاونٹس کلرک کی طرح اپنی تمام گزری ہوئی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کر رہی ہو۔
ایک یہی بات تھی جو اُسے ایک دم ناپسند تھی۔ وہ اپنی زندگی میں حساب کتاب کی بڑی کچی تھی۔ جب سے اُس نے ملازمت شروع کی تھی ایک بار بھی اپنی تنخواہ کے نوٹوں کو نہیں گِنا تھا۔ دفتر کا کیشیر ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو، اُسکی تنخواہ کا پیکٹ اُسے پکڑاتا اور ہر بار ہی اس سے کہتا کہ وہ نوٹ گِن لے لیکن اس نے کبھی اُس کی بات نہیں مانی اور ہمیشہ بِنا گنے تنخواہ کا لفافہ اپنے پرس میں ڈال لیا۔ ایک دفعہ کیشیر نے جان بُوجھ کر اُسے دو سو روپے کم دیئے اور اُس نے معمول کی طرح لفافہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ گھر جا کر بھی رقم کو نہیں گِنا۔ دو

دن کے بعد کیشیر نے اُسے بتایا کہ اس نے دو سو روپے کم دیئے تھے اور سوچا تھا کہ اُس کی باس گھر جا کر رقم کو ئےگنے گی اور سوچے گی کہ کیشیر اُسے ہر بار ہی کم رقم دیتا تھا۔ پھر کیشیر نے دو سو روپے دیئے اور کہا کہ جب بھی کسی سے رقم لی جائے یا کسی کو دی جائے تو اُسے گِننا ضرور چاہیے۔ لیکن اُس خدا کی بندی نے عمر بھر بھی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا بلکہ اس کے ردِّعمل کے طور پر اُسے ان تمام لوگوں سے چِڑ ہو گئی جو حساب کتاب کرتے تھے ۔ وہ اکاونٹس والے لوگوں کو ناپسند کرنے لگی یہاں تک کہ بینکوں میں کام کرنے والے لوگوں سے بھی اس کا خدا واسطے کا بیر ہو گیا ۔ اس طرح کی ذہنی ساخت بن گئی تھی انورادھا کی ۔

اور اب دو دن سے وہ اپنی زندگی کے لمحوں کا حساب کتاب کر رہی تھی اور اس کی وجہ سے اسے بڑا ذہنی تناؤ تھا ۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی اور انورادھا ابھی تک جاگ رہی تھی ۔ زیرو کینڈل پاور کا نیلے رنگ کا بلب جل رہا تھا جس کی وجہ سے کمرے میں ہلکی سی پراسرار قسم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔ انورادھا کو سونے کے کمرے میں گہرا اندھیرا پسند

نہیں تھا ۔ دراصل اندھیرے سے اسے خوف آتا تھا ۔ اسے لگتا تھا
جیسے اندھیرے میں دیواروں پر عجیب عجیب شکلیں ناچتی رہتی
تھیں اور اسے ڈراتی رہتی تھیں ۔ لیکن آج تو کیفیت بالکل ہی
مختلف تھی ۔ آج تو اُسے ہلکی سی روشنی میں بھی ڈر لگ رہا تھا اور
عجیب عجیب سے پیکر کمرے کی دیواروں پر حرکت کر رہے
تھے ۔ یہ سب گمنام پیکر تھے اور وہ ان میں سے کسی کی بھی
شناخت نہیں کر سکتی تھی ۔ اسی لئے وہ اور بھی زیادہ پریشان
تھی ۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ تمام لوگ جو کبھی نہ کبھی اس کی
زندگی میں آئے تھے ، آج کی رات اس کے کمرے میں جمع
ہو گئے تھے اور اس سے اپنا حساب چُکتا کر رہے تھے ۔ آج جیسے
وہ کسی ان نیشنلائیزڈ چھوٹے سے بینک کا برانچ مینجر بن گئی
تھی اور سب اپنے اپنے چھوٹی چھوٹی رقموں کے ڈس آرڈ چیک
لے کر انہیں بھُنانے اس کے پاس آرہے تھے ۔ ایک ہجوم اکٹھا
ہو گیا تھا برانچ مینجر کے کمرے میں اور بینک کا کیشیر اسے کہہ
رہا تھا کہ ان کی برانچ میں اس وقت اتنی رقم نہیں تھی کہ سارے
چیک کیش کئے جا سکیں ۔ اس کے لئے ہیڈ کواٹر سے لوہے
کے بکسے میں مزید رقم منگوانی پڑے گی اور آدھی رات کو یہ

کسی بھی حالت میں ممکن نہیں تھا ۔ چیک کیش کرانے والوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور کسی وقت بھی کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہو سکتا تھا۔ کیشیر بے بسی کے عالم میں اس کے سامنے کھڑا تھا ۔

"ہمیں الارم بجا دینا چاہیے " کیشیر نے مشورہ دیا تھا

" کیوں ؟"

"بھیڑ بینک پر حملہ کر سکتی ہے "

"نہیں الارم نہیں بجانا چاہیے ۔ یہ حملہ کرنے والی بھیڑ نہیں ۔ "

"تو کیسی بھیڑ ہے میڈم ؟"

"یہ پریشان اور نہتے لوگوں کی بھیڑ ہے ۔"

"تو ہم انہیں کہہ دیتے ہیں کہ صبح آئیں ان سب کے چیک کیش ہو جائیں گے ۔"

"یہ ڈس آنرڈ چیک ہیں ۔ صبح بھی کیش نہیں ہوں گے ۔"

"تو پھر کیا کیا جائے ؟"

"ان سب سے چیک لے لیجیے ۔"

انورادھا کو لگا کہ کمرے کی دیواروں پر حرکت کرتے

ہوئے لوگوں سے ایک شخص اُن کے ڈِس آنرڈ چیک اکٹھے کرتا جا رہا تھا۔

انورادھا نے جب غور سے دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ خود ہی اس چھوٹے سے بینک کا کیشیر تھی اور وہ خود ہی ڈھیروں ڈس آنرڈ چیک، بینک کے اندر جمع لوگوں سے کولیکٹ کر رہی تھی۔

بھیڑ میں سب سے آخر میں کھڑا شخص ستونت تھا۔

جب انورادھا اس کے ہاتھ سے چیک لینے لگی تو وہ بولا

"میرے چیک کی رقم سب سے زیادہ ہے اسے سب سے پہلے کیش کر دیجیے۔"

"آپ کا اکاونٹ تو کلوز ہو چکا ہے چیک کیش نہیں ہو سکتا۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"نیا اکاونٹ کھلوائیے۔"

"کہاں؟"

"کسی دوسرے بینک میں۔"

"یہاں کیوں نہیں؟"

"یہ بینک فیل ہو چکا ہے ۔"
انورادھا نے دیکھا ستونت بڑا غمگین اس کے سامنے کھڑا
تھا اور کہہ رہا تھا
"مجھے تو آپ سے اپنا قرضہ واپس لینا ہے ۔میرا قرضہ تو
واپس دیجیے ۔"
"نہیں ۔" انورادھا زور سے چیخی اور پھر ہڑ بڑا کر اس
نے بجلی جلا دی ۔ دیوارو ں پر حرکت کرتے ہوئے سبھی پیکر
غائب ہو گئے ۔ان میں ستونت بھی شامل تھا جو اس سے اپنا قرضہ
وصول کرنے آیا تھا ۔
کمرے میں اب بھر پور روشنی تھی
اور صبح کے تین بج رہے تھے ۔
اسے لگا کہ حساب کتاب کی پٹاری تو اب بھی کھلی تھی
اس پر تو کسی نے ڈھکنا رکھا ہی نہیں تھا ۔
وہ بستر سے اٹھی ۔
اسے بڑے زور کی پیاس لگ رہی تھی ۔اس نے تپائی
پر رکھی تھرموس سے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹاغٹ پی گئی ۔
اس کا سینہ جیسے اندر سے جل رہا تھا ۔

پھر وہ باتھ رُوم میں گئی ۔ وہ رات کو باتھ رُوم میں
روشنی جلتی رہنے دیتی تھی ۔اس نے ویسے ہی غیر ارادی طور پر
آئینے میں دیکھا جیسے ہم باتھ رُوم میں داخل ہوتے اکثر دیکھتے ہیں
حالانکہ کئی بار دیکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا ۔
آئینے میں ستونت موجود تھا ۔
ویسا ہی غمگین اور بے بس جیسے وہ ابھی کچھ دیر پہلے
کمرے کی دیوار پر نظر آرہا تھا
انورادھا ٹھٹھک گئی ۔
"یہاں کیا کررہے ہو تم ؟"
"اپنے قرضے کی وصولی کا پھر تقاضا کر رہا ہوں ۔"
"مجھے تمھارا کوئی قرضہ نہیں دینا ۔"
"تم سُود مت دو لیکن میری اصل رقم تو واپس کرو ۔
ویسے تو اب تک سُود کی رقم بھی اصل سے کئی گنا ہو گئی
ہو گی ۔"
"میں نے اپنے پُرانے حساب کتاب ختم کر ڈالے ہیں ۔"
"لیکن مجھے تو اپنا حساب کتاب پوری طرح یاد ہے ۔میں
نے اسے ختم نہیں کیا ۔"

"تو جاؤ جہنم میں ۔"

"وہیں سے تو میں آیا ہوں ۔"

"دفع ہو جاؤ ۔" یہ کہہ کر انورادھا چیچھے کو مُڑی کہ کوئی چیز اٹھا کر آیئنے پر پھینک دے ۔ آیئنہ ٹوٹ جائے اور اس میں جھانکتی ہوئی شکل ایکدم غائب ہو جائے ۔

لیکن اسی لمحہ معجزہ ہو گیا !

انورادھا نے دیکھا کہ آئینے میں ستونت کی جگہ اس کا بھائی اشوک کھڑا تھا ۔

وہ بڑی معصومیت سے مسکرا رہا تھا ۔

وہ بولا ۔

"دیدی، میرا بھی حساب کتاب ہے"۔

"کونسا حساب کتاب !"

"آج سے پانچ سال پہلے والا ۔ جب تم نے میرا ایڈمشن میڈیکل کالج میں کروایا تھا ۔ اپنی ڈھیر ساری رقم کے علاوہ بینک سے قرضہ بھی لیا تھا ۔ تم یہ سب کچھ نہ کرتیں تو میں ڈاکٹر کیسے بنتا ۔"

"وہ میرا فرض تھا ۔"

"اب میں اِس پوزیشن میں ہوں کہ وہ ساری رقم واپس کردوں اور تم بینک والوں سے لیا لون لوٹا دو۔"۔

"مگر میں اب اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"کیوں۔"

"جِن جِن بینکوں میں میرا حساب تھا وہ سب فیل ہوگئے ہیں۔"

"کیسے؟"

"مجھے خود معلوم نہیں۔ مگر تم یہاں کیسے پہونچ گئے ہو؟"

"سُورت سے ڈر کر بھاگ آیا ہوں۔"

"اور شانتی؟"

"وہ مجھ سے پہلے بھاگ آئی ہے۔ اُسے ہی کھوجنے آیا ہوں۔"

"شانتی کو کھوجنے آئے ہو؟"

"ہاں دیدی؟"

"وہ یہاں تو نہیں آئی۔"

"مجھے تو اس نے یہی کہا تھا کہ وہ چنڈی گڑھ جارہی

تھی۔"

"پاگل ہو رہے ہو کیا؟"

"ہاں مجھے مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرادو۔"

اور پھر انورادھا نے دیکھا کہ اشوک نے پاگلوں کی طرح زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے تھے۔

اور پھر اچانک آیئنے کی سطح ایکدم صاف ہو گئی۔

آیئنے میں نہ ستونت تھا اور نہ اشوک۔ البتہ اسکے قہقہے ابھی تک باتھ رُوم میں گُونج رہے تھے۔

انورادھا فورا باتھ رُوم سے نکل کر کمرے میں واپس آ گئی۔ اس کا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو بستر پر گرادیا۔ پھر اُس پر غنودگی چھا گئی۔

جب انوردھا کی آنکھ کُھلی تو باہر روشنی پھیل رہی تھی۔

رات ختم ہو گئی تھی اور دن چڑھ رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو ہلکے سے کمبل میں ڈھک لیا اور آنکھیں بند کر کے سر کو تکیئے پر رکھ دیا۔ اُس کے ذہن میں ابھی تک اُتھل پُتھل تھی۔ جو تجربہ اُسے رات ہوا تھا وہ اسی کا تجزیہ کر رہی تھی لیکن سب کچھ دُھندلا سا تھا۔ کچھ

بھی صاف اور واضح نہیں تھا۔
ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کوشل کا فون تھا۔
"کہو رات کیسی گزری؟"
"بہت خراب۔"
"کیا ہوا؟"
"تین بجے تک تو جاگتی رہی۔"
"پھر؟"
"پھر ہیلیوسی نیشنز پریشان کرتے رہے۔"
"تم تو پریشان ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتی ہو۔"
"اور تم اپنے فضول قسم کے کومینٹس کے لئے۔"
انورادھا نے دوسری طرف سے کھلے قہقہے کی آواز سنی تو اُسے بُرا نہیں لگا۔ لے دے کے وہی تو ایک آدمی تھا جو ہر سچویشن میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔
"آج آفس جارہی ہو نا؟"
"ہاں۔"
"تو دوپہر کو میری طرف آجانا، لنچ کے لئے۔"

"اچھا۔"

اور گفتگو نہیں ہوئی۔

انورادھا تیار ہوکر ساڑھے نو بجے کے قریب آفس چلی گئی۔

ساڑھے گیارہ بجے دفتر کے چپڑاسی نے دروازہ کھول کر انورادھا سے کہا کہ کوئی صاحب اس سے ملنے آئے تھے۔ اس نے اندر آنے کے لئے کہہ دیا۔

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کا بھائی اشوک اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر، اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ارے تم!"

"ہاں دیدی"

انورادھا نے اسے اپنی بانہوں میں لے کر اس کا ماتھا چُوم لیا

"کب پہونچے تم؟"

"صُبح پانچ بجے، کالکا میل سے"۔

"کہاں رہے اب تک؟"

"میں سیدھا پی جی آئی چلا گیا تھا میڈیکل ٹیسٹ کے لئے ۔ میڈیکل کوڈ آف کانڈیکٹ یہی کہتا ہے ۔"

"اچھا کیا تم نے ۔ ورنہ ایک اور جھگڑا کھڑا ہو جاتا "۔

انورادھا نے خود ہی اشوک کا چھوٹا سا اٹیچی کیس اُٹھا کر ایک طرف رکھا اور چپراسی کو چائے لانے کے کہا۔

اشوک نے بتایا کہ پی جی آئی کے ایک ڈاکٹر کے مطابق سُورت سے چنڈی گڑھ آئے ہوئے ایک آدمی کو اسپتال میں ایگزیمن کرنے کی بعد علاج کے لئے آئی سولیشن وارڈ میں رکھا گیا تھا اور وہاں سے وہ بغیر کسی اطلاع کے غائب ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے پی جی آئی میں بڑی بچینی تھی ۔ ایسا ہی ایک مریض جنرل اسپتال میں داخل کیا گیا تھا ۔ اٹھارہ سالہ اس نوجوان کا نام اجیت سنگھ تھا اور وہ موہالی کا رہنے والا تھا۔اس کے بارے میں مزید واقفیت اس لئے نہیں مل سکی کہ موہالی میں اس کے گھر تالا لگا ہوا تھا اور کسی کو اس نوجوان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

انورادھا کو یہ سن کر حیرت ہوئی ۔ اخباروں میں تو ان دونوں کیسوں کا ذکر نہیں تھا۔ہوسکتا ہے ایک آدھ دن میں

کوئی اخبار اس خبر کو دے ۔

چائے پیتے ہوئے انورادھا نے کہا۔

"تمھارے تار نے تو ایکدم دہلا دیا ۔ وٹ ہیپنڈ ٹو شانتی؟"

"کیا بتاؤں دِیدی ۔ اسے بس مرنا ہی تھا۔" یہ کہتے ہوئے اشوک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کچھ بتاؤ تو سہی ۔"

"کیا بتاؤں دِیدی ۔ بڑی ٹریجک کہانی ہے ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جب انسانی آبادی کو بڑی لیول پر ختم ہونا ہو تو اس میں کوئی غائبانہ ہاتھ ضرور ہوتا ہے ۔ سُورت میں انسانوں کی تباہی میں ان کا اپنا ہاتھ تو ہے ہی لیکن اس میں کسی آسمانی طاقت کا بھی ہاتھ ہے ۔

سُورت کے بہت بڑے کاروباری اور صنعتی شہر میں پانچ لاکھ لوگ پسماندہ علاقوں میں رہتے ہیں ۔"

"دو سال پہلے چنڈی گڑھ کی کل آبادی پانچ لاکھ کے قریب تھی ۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر اس ساری آبادی کو سلمز میں ہی رہنا پڑتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟"

"پھر یہ سِٹی دِی بیوٹی فُل نہ بن پاتا بلکہ نرک بن جاتا ۔"
اشوک نے کہا
"چھوٹے چھوٹے نرک تو ہر بڑے شہر میں ہوتے ہیں لیکن وہ عام آدمی کی آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں"۔
"نرک تو ہر آدمی کے اندر بھی ہوتا ہے دِیدی ۔"
"ہائے کیا بات کہہ دی ہے تم نے ۔ اور ہر آدمی کسی نہ کسی کشش اپنے اپنے نرک کی آگ میں جلتا بھی ہے ۔"
"میں بھی تو جل رہا ہوں اپنے ہی نرک میں کئی دنوں سے دِیدی ۔" یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے ایک لمبی سرد آہ نکل گئی ۔ "سُورت شہر میں ایسے کئی علاقے ہیں جو ایک دم نرک ہیں اور پانچ لاکھ سے زیادہ مرد عورتیں اور بچے ان میں زندگی گزار رہے ہیں ۔ کٹارگم ، ویدررڈ اور رام نگر کے علاقے تو پوری طرح سے دوزخ کا نظارہ پیش کرتے ہیں ۔ ہر جگہ گندگی کے بڑے بڑے ڈھیر جن میں سڑانداور بدبُو دن رات نکل کر چھوٹی چھوٹی کچی جھونپڑیوں میں داخل ہوتی رہتی ہے ۔ گندے پانی کے جوہڑ جن میں فیکٹریوں سے نکلتا ہوا زہر گھلتا رہتا ہے اور جس کے نکاس کا کوئی سادھن نہیں ۔ ڈھور ڈنگر مر جائیں تو

کئی دنوں تک کارپوریشن کا کوئی آدمی مردہ جانوروں کو اٹھاتا نہیں ۔ پلیگ کا سب سے پہلا حملہ ان ہی بستیوں پر ہوا ۔ کٹار گم اور وید روڈ والے علاقوں میں مقامی لوگوں نے دو کلینکوں کی توڑ پھوڑ کی اور انہیں جلا ڈالا کیوں کہ ان کے مالک غیر سُورتی ڈاکٹر بھاگ گئے تھے ۔ خبر یہ تھی کہ قریب قریب ایک ہزار پرائیویٹ ڈاکٹر سُورت چھوڑ کر بھاگ گئے تھے ۔ سرکاری اسپتالوں کی حالت ویسے ہی خراب تھی ۔ جو پرائیویٹ اسپتال اس نازک وقت میں مصیبت زدہ لوگوں کا ساتھ دے رہے تھے اُن میں ڈاکٹر کانتی اگروال کا مدر ٹریسا اسپتال پیش پیش تھا ۔"

"وہی اسپتال جس میں تم کام کرتے ہو؟"

"ہاں وہی اسپتال جس میں پچھلے دو سال سے ڈاکٹر شانتی اگروال بھی اپنے بھائی کے ساتھ کام کر رہی ہے ۔ شانتی بڑی ہی کمٹڈ ڈاکٹر تھی ۔ ہمارے اسپتال کے سب ڈاکٹر دن رات اُن علاقوں میں کام کر رہے تھے جہاں پلیگ کے کیس ہو رہے تھے ۔

"شانتی اور میں رام نگر کے علاقے کو دیکھ رہے تھے جس میں اچانک ہی پلیگ کے کئی نئے کیس ہو گئے تھے ۔ وہ پلیگ

کے شدید حملے سے متاثر ایک چھوٹے سے بچے کو بچانے میں
لگی تھی ۔میں نے کئی بار اسے ٹوکا بھی ۔ احتیاط برتنے کی بھی
ہدایت کی لیکن وہ اپنی ضد کی پکی 'اس بچے کو بچانے پر تُلی
تھی جس کی ماں نے رو رو کو اپنے آپ کو ہلکان کر ڈالا تھا ۔
دیدی اس کی ضد ہی نے اس کی جان لے لی ۔جب وہ اس بستی
سے لوٹی تو مجھے شک ہوا کہ اسے بھی انفیکشن ہو گیا تھا ۔ کانتی
بھائی نے اپنی جان لڑادی اُسے بچانے میں ۔ خدمت میں میری
طرف سے بھی کوئی کمی نہ تھی ۔جو کچھ ہوسکتا تھا ہم نے کیا لیکن وہ
بچ نہ سکی ۔اس کی موت کا یہ اثر ہوا کہ ہمارے اسپتال میں کام
کرنے والے باہر کے کئی ڈاکٹر اسپتال چھوڑ کر بھاگ گئے ۔لیکن
میں نہیں بھاگ سکا ۔ میرے پاؤں میں تو جیسے کسی نے کیل گاڑ
دی تھی ۔ میں تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا ۔ لیکن ڈر نے
میرے دل و دماغ کو بری طرح اپنی پکڑ میں لے لیا تھا ۔
شانتی کی ڈیڈ باڈی کو جلا کر واپس آنے کی بعد مجھے تمام رات یہ
احساس ہوتا رہا کہ میں خود بھی آگ کے شعلوں میں جل رہا ہوں"

"ویری سیڈ اشوک ۔"

"کانتی بھائی کے تو سارے خواب ہی ٹوٹ گئے تھے ۔

وہ تو اسپتال کا آدھے سے زیادہ کام میرے اور شانتی کے ذمے
سونپ دینا چاہتا تھا ۔ اسی لئے اس کی خواہش تھی کہ ہم اگلے
سال کے شروع میں ہی ٹھیک اُس کے برتھ ڈے پر شادی
کرلیں ۔

شانتی کی موت کے بعد وہ بُری طرح ٹوٹ گیا تھا ۔میں
بھی چاہتا تھا کہ اسپتال کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں لیکن ہمت نہ
ہو رہی تھی ۔میں اپنا کام تو کر رہا تھا لیکن کئی ڈاکٹروں کے چلے
جانے سے میرا موریل بے حد کمزور ہوگیا تھا ۔لیکن کمال ہے
کانتی بھائی کا ۔

پرسوں شام اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے
ہوئے کہا ۔

شانتی کی موت کا کتنا صدمہ ہوا ہے تمہیں ،میں جانتا
ہوں ۔

تمہیں کون سا کم صدمہ ہوا ہے کانتی بھائی
میرا تو فیوچر ہی ختم ہو گیا ہے
میری تو تمام زندگی ہی تباہ ہوگئی ۔ یہ کہتے ہوئے میں
پھپھک پڑا ۔ کانتی بھائی نے مجھے اپنے سینے سے لگالیا اور کہا ۔

تمہیں کچھ دنوں کی لئے اپنی ڈیڈی کے پاس چلا جانا چاہیے۔جب سنبھل جاؤ تو واپس آجانا ۔ یہ اسپتال تمھارا ہی ہے ۔ تمہیں اس سمے مارل سپورٹ کی ضرورت ہے ۔اس نے دہلی کا ایر ٹکٹ میرے ہاتھ میں دیا اور ایک پیکٹ میں دس ہزار روپے ڈال کر مجھے گھر سے وداع کر دیا۔

"کانتی بھائی از اے گریٹ مین ۔"

"لیکن میں بڑا بزدل ہوں ۔بھاگ کر تمھارے پاس آگیا ہوں ۔"

"تم نے ٹھیک ہی کیا ہے ۔" یہ ساری بات سن کر انورادھا کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں ۔

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد انورادھا نے کہا

"کوشل نے لنچ کے لئے کہہ رکھا ہے، چلوگے ؟"

"یہ کوشل صاحب کون ہے ؟"

"میرا ایک دوست ہے ۔ اے گریٹ پرسن۔"

"میں اس وقت کہیں جانے کے موڈ میں نہیں ہوں ۔ مجھے تم گھر چھوڑ دو ۔"

"ٹھیک ہے ۔تم جا کر آرام کرو۔ میں لنچ کی بعد کچھ دیر

کے لئے دفتر آؤں گی اور پھر گھر آجاؤں گی"۔
انورادھا نے اشوک کو اپنے فلیٹ پر چھوڑا۔ اُسے کچھ کھلایا پلایا بھی دیا اور پھر اُسے آرام کرنے کو کہہ کر کوشل کے آفس چلی گئی
لنچ کے لئے وہ لیٹ نہیں تھی۔

۸

انورادھا ٹھیک ڈیڑھ بجے کوشل کے دفتر پہونچ گئی۔
"کیا پنکچوایلٹی ہے۔مان گئے حضور۔" کوشل نے کہا
"عورت اور موت ہمیشہ پنکچوال ہوتی ہیں"۔
"اور اگر عورت اور موت دونوں مِل جائیں ؟"
"تو سمجھو قیامت آگئی۔ "انورادھا نے جواب دیا
"لگتا ہے آج آفس میں کام نہیں تھا۔"
"کام تو تھا لیکن اچانک اشوک پہونچ گیا۔"
"کہاں ؟۔"
"آفس میں۔"
"چنڈی گڑھ کب پہونچا وہ ؟"
"آتو وہ صبح کالکا میل سے گیا تھا۔ لیکن پی جی آئی چلا گیا تھا میڈیکل ٹیسٹ کے لئے۔"
"یہ تو ٹھیک کِیا اُس نے۔سُنا ہے پی جی آئی میں پلیگ کا ایک کیس آیا تھا۔وہ آئی سولیشن وارڈ سے غائب ہو گیا۔"
"ایک کیس جنرل ہاسپٹل سے بھی غائب ہو گیا ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"
"اشوک ہی نے ۔ پی جی آئی میں تو بڑا چرچا تھا اس بات کا ۔"
"آخر اشوک بھی ڈر کر بھاگ ہی آیا سُورت سے؟"
"دراصل ڈاکٹر شانتی اگروال کی موت سے اُسے بڑا گہرا صدمہ ہوا ہے ۔ اس کی موت بھی بڑی درد ناک حالت میں ہوئی ہے ۔"
"کیسے؟"
"پلیگ سے بیمار ایک بچّے کی جان بچانے کی کوشش میں ۔ اشوک اور شانتی دونوں ہی اس بستی میں بیماروں کی دیکھ بھال کر رہے تھے ۔ میرے خیال سے شانتی نے زیادہ احتیاط نہیں برتی ۔ بے چاری قابو آ گئی ۔"
"ذہنی طور پر تو بہت اُکھڑ گیا ہو گا بے چارہ ۔"
"ہاں ۔ شانتی کی موت کے بعد مدر ٹریسا ہاسپٹل کے کچھ ڈاکٹر بھی ہاسپٹل چھوڑ گئے ۔"
"ڈر گئے ہوں گے غریب ۔"
"شانتی کے بھائی ڈاکٹر کانتی اگروال نے خود اشوک

سے کہا کہ وہ خود کچھ دنوں کے لئے چنڈی گڑھ چلا جائے۔ اُس نے اسے ایر ٹکٹ بھی دیا اور دس ہزار روپے بھی۔"

"اِزاِٹ؟"

"یس۔ اور یہ بھی کہا کہ اشوک کو اس وقت مارل سپورٹ کی ضرورت تھی۔ اس لئے اسے کچھ دیر کے لئے میرے پاس آجانا چاہیے۔"

"میرے خیال سے یہ بات صحیح ہے۔"

"لیکن ڈر کا عنصر پھر بھی موجود ہے سارے پروسیس میں، انورادھا نے کہا

"وہ تو ہو گا ہی۔ اشوک فرشتہ تو نہیں انسان ہے۔ لوگ تو جنگ کے محاذ سے بھی بھاگ جاتے ہیں۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن تم اشوک کو ساتھ کیوں نہیں لائیں؟"

"اس کا کہیں بھی جانے کا مُوڈ نہیں تھا۔ بے حد تھکا ہوا تھا۔"

"تو کہاں چھوڑ آئی ہو اُسے؟"

"گھر چھوڑ آئی ہوں۔"

"بھو کا پیاسا ؟"

"کچھ کِھلا پِلا بھی دیا تھا ۔ اب آرام کر رہا ہے ۔ شام تک سنبھل جائے گا ۔"

"رات کو اسے میرے ہاں لے آنا' کھانے پر ۔"

"رات کی بات کر رہے ہو ۔ پہلے دوپہر کی بات تو ختم کرو ۔ تم نے تو مجھے لنچ پر انوائیٹ کیا تھا ۔"

"بہت بھُوک لگ رہی ہے ؟"

"ہاں ۔ صبح بس چائے کی ایک پیالی پی کر ہی آفس چلی گئی تھی ۔"

"ناشتہ نہیں کیا تھا ۔"

"پچھلے تین چار روز سے یہی روٹین چل رہا ہے ۔"

"تو چلو پہلے ناشتہ کرلینا پھر لنچ ۔"

"ہمیشہ اُلٹی باتیں کرتے ہو ۔ تمھارے سوچنے کا انداز واقعی ایب نارمل ہے ۔"

ہوٹل شوالک ویو میں پہونچتے ہونچتے اڑھائی بج گئے ۔ جب انھوں نے کھانا ختم کیا تو چار بج رہے تھے ۔ کچھ بات ہی ایسی ہو گئی تھی ۔ کوشل نے ڈرائیِ جن لے لی تھی ،ہر انورادھا

دھیرے دھیرے سافٹ ڈِرنک کو ہی سِپ کرتی رہی۔ سافٹ ڈرنک کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے انورادھا نے کہا۔

"میں نے اشوک سے پوچھا۔ کوشل نے لنچ کے لئے کہہ رکھا ہے چلوگے۔"

"کیا جواب دیا اُس نے؟"

"اُس نے پوچھا ___ یہ کوشل صاحب کون ہیں؟"

"لگتا ہے بڑا مہذب لڑکا ہے"۔

"کیوں؟"

"ورنہ وہ پوچھ سکتا تھا۔ یہ کوشل کون ہے"۔

"نہیں وہ بد تمیز نہیں ہے"۔

"تمہاری طرح؟"

"لگتا ہے جِن چڑھ گئی ہے"۔

تمہیں شاید معلوم نہیں جِن نہیں چڑھتی بُھوت چڑھتے ہیں"۔

"تم تو خود بُھوت ہو"۔

"اور تم؟"

"ڈائین"

"ارے نہیں تمہیں کیوں وہم ہے یہ ۔ تم تو سبز پری ہو"۔

"اس لیے کہ آج میں نے گرین شیڈ کی ساڑھی پہن رکھی ہے"۔

"حضور یہ نیلے شیڈ کی ساڑھی ہے"۔ کوشل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ۔

" تمہیں اب بھی وہم ہے کہ تمہیں نشہ نہیں ہوا"۔

"وہم نہیں یقین ہے"۔

چلو ہم تمہارے یقین کو نہیں توڑتے"۔ انورادھا نے بڑے پیارے انداز میں کہا ۔

"اس کرم کے لیے شکریہ"۔

"ساحر کا کیا مصرع ہے جو کبھی کبھی تم گنگنا یا کرتے ہو؟"

"چلو اک بار پھر سے ،اجنبی بن جائیں ہم دونوں"۔

" اشوک کے اس سوال سے کہ کوشل صاحب کون ہیں میرے دل خیال آیا کہ میں ایک بار پھر ان واقعات کا جائزہ لوں جنھوں نے مجھے تعلقات کی ان منزل پر پہونچایا"۔

"اجازت ہو تو میں ایک جن اور لے لُوں"۔
"اجازت ہے"۔ انورادھا نے بڑے پیار سے لہجے میں جواب دیا۔

کوشل نے اپنے لیے ایک جن اور انورادھا کے لیے فروٹ جُوس منگوایا اور پھر دونوں نے چار سال پہلے کی گھٹنا کو اپنے ذہن کے پردے پر اُبھارنا شروع کیا۔

ٹیگور تھیٹر میں امجد حسین خان کا پروگرام تھا۔ بہت بھیڑ تھی۔ کوشل ایسے پروگراموں میں جاتا تو ضرور تھا لیکن اگلی قطاروں کی کسی سیٹ پر نہیں بیٹھتا تھا۔ پانچویں ساتویں قطار کی کسی کونے کی سیٹ پر بیٹھتا تھا تاکہ جب وہ اٹھ کر باہر جائے تو کوئی ڈسٹرب نہ ہو۔ ایک عادت اس کی یہ بھی تھی کہ وہ پروگرام کے ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی ہال سے باہر آجاتا تھا تاکہ ہال سے باہر نکلتی ہوئی بھیڑ کے دھکوں سے بچ جائے اور کاروں کی بھیڑ میں سے اپنی گاڑی آسانی سے نکال کر گیٹ سے باہر نکل جائے۔

اس بار بھی اس نے ایسا ہی کیا۔

جب وہ اپنی کار کے پاس پہونچا تو اس نے دیکھا کہ

کوئی خاتون اس کی طرح ہی امجد حسین خان کے پروگرام کے ختم ہونے سے پہلے ہی ہال سے باہر نکل آئی تھی اور اُس کی ماروتی کار کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"پلیز ایکسکیوزمی، دِس اِز ناٹ یُور کار"۔

"آئی ایم سوری"۔ وہ عورت خوبصورت بھی تھی اور سمارٹ بھی۔

"آیئے میں آپ کی کار تلاش کر دیتا ہوں ۔ کیا نمبر ہے آپ کی گاڑی کا؟"۔

"سی ایچ ۱۷۱۰"۔

"میری کار کا نمبر سی ایچ ۱۷۲۰ ہے"۔

"شاید اسی لیے غلطی ہوئی"۔

"پلیز ڈاونٹ مایئنڈ اِٹ"۔

جب اس خاتون کی گاڑی لو کیٹ ہو گئی تو اُس نے محض ایٹی کیٹ کی وجہ سے کہا۔

"چلئے میں اپ کو آپ کی کار تک چھوڑ آؤں"۔

وہ عورت اتنی خوبصورت تھی کہ وہ اس کی آفر رد نہ کرسکا۔ جب وہ اپنی کار تک پہونچا اور چابی نکالنے کے لئے

کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو گھبرا گیا۔ جیب میں گاڑی کی چابی نہیں تھی۔

"لگتا ہے چابی نکالنا بھول گیا ہوں۔ وہ گاڑی کے اندر ہی رہ گئی ہے۔ وٹ اے فول آئی ایم"۔

"ڈپلی کیٹ چابی کہاں ہے؟"۔

"وہ تو گھر پر ہے۔ آپ کو بے کار تکلیف دی۔ آپ چلئے، ابھی لوگ ہال سے باہر آئیں گے تو کسی جان پہچان والے شخص کو گھر لے چلوں گا اور ڈپلی کیٹ چابی لا کر گاڑی کا دروازہ کھولوں گا"۔

"آپ کس سیکٹر میں رہتے ہیں؟"۔

"سیکٹر نو میں"۔

"تو میری گاڑی میں بیٹھئے میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ؟"۔

"آپ؟"۔

"اس میں بُرائی ہے کچھ؟"

"بالکل نہیں۔ آپ کی عنایت ہے"۔

"آپ اُردو بہت اچھی بولتے ہیں"۔

"شکریہ"۔
"آپ کی آواز میں بھی گہرائی ہے"۔
"تھینکس"
"آپ کو گانے کا بھی شوق ہے ؟"۔
"جی تھوڑا بہت ہے"۔
یہ گفتگو کار کے اسٹارٹ ہونے کے بعد ہوئی ۔
"آپ کی ڈرائیونگ بڑی سموتھ ہے "۔
"دراصل میں تیز ڈرائیو کر ہی نہیں سکتی ۔ ہر لمحہ ان سیکیورٹی کا احساس رہتا ہے"۔
"مجھے یہ احساس کم سپیڈ پر گاڑی چلانے میں ہوتا ہے"۔
"تو آپ گانا اونچی آواز میں گاتے ہوں گے"۔
"آپ کو کیسے معلوم ہے"۔
"کل جب آپ پربھات کے سمے ریاض کر رہے تھے تو میں لین سے گذر رہی تھی"۔
"آپ رات کو سوتی نہیں ہیں ؟"۔
"میں دن میں بہت سو لیتی ہوں"۔
"آپ کسی گورنمنٹ آفس میں کام کرتی ہیں ؟"۔

"جی ہاں"۔

"سرکاری دفتروں میں افسر سونے کے علاوہ کرتے ہی کیا ہیں"۔

"اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں"

"گاڑیاں غلط ڈائیریکشن میں چلاتے ہیں"۔

"سوری ۔ نو سیکٹر سے تو ہم آگے نکل آئے ۔میں گاڑی موڑتی ہوں ۔ اب آپ گفتگو نہ کیجئے ۔ صرف اشارے سے راستہ بتاتے جائیے"۔

یوں کوشل کے ہاتھ کے اشاروں سے راستہ جانتے ہوئے گاڑی اس کے گھر کے سامنے رُک گئی۔

"اندر نہیں آیئے گا"۔

"دیر ہو جائے گی ۔ پروگرام بھی ختم ہونے والا ہے ۔ آپ ڈُپلی کیٹ چابی لے آئیے"۔

کوشل نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا اور پھر کچھ دیر میں گاڑی کی چابی لے کر آگیا۔

"اور کون لوگ ہیں آپ کے گھر میں ؟" انورادھا نے پوچھا۔

"اور کوئی نہیں"۔

"آئی سی"۔

انورادھا نے گاڑی گھمائی اور اسے اٹھارہ سیکٹر کی طرف موڑ دیا جہاں ٹیگور تھیٹر تھا۔ جب وہ پہونچے تو پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ اور بہت سے لوگ جا چکے تھے چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں کوشل کی گاڑی بھی تھی۔

انورادھا کی گاڑی سے اترنے سے پہلے کوشل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کا وزیٹنگ کارڈ لے لیا۔

"میرے پاس میرا کارڈ نہیں ہے ویسے میرے ٹیلی فون کا نمبر نوٹ کر لیں"۔

انورادھا نے گاڑی کی روشنی جلا کر کوشل کے آفس ٹیلی فون کا نمبر نوٹ کیا اور پھر گڈ نائٹ کہہ کے گاڑی ٹیگور تھیٹر کے گیٹ کی طرف موڑ دی۔

کوشل کچھ دیر ڈپلی کیٹ چابی کو گھماتا رہا اور اپنی کار کے پاس کھڑا دوسری کاروں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کوشل کی گاڑی سب سے آخر میں گیٹ سے باہر نکلی۔ لیکن وہ اپنے گھر کی طرف نہیں گیا۔ چنڈی گڑھ لیک کی طرف

چلا گیا اور گاڑی پارک کر کے لیک کے کنارے کھڑا ہو کر دیر تک گہرے نیلے آسمان میں چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھتا رہا اور جھیل کے ساکن پانی کو دیکھتا رہا اور چنڈی مندر کینٹونمینٹ کی روشنیوں کو نہارتا رہا جو بِنا مقصد کے خاموش رات کے اندھیرے میں ٹمٹما رہی تھیں۔

جب وہ گھر پہونچا تو آدھی رات ہونے کو تھی۔

اس کا من کچھ کھانے کو نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک سِٹف ڈرنک لیا اور پھر بستر میں لیٹ گیا اور فراق کے شعر گنگناتا رہا۔

اگلے روز کوئی گیارہ بجے کے قریب انورادھا کا ٹیلی فون آیا۔

"گاڑی کی چابی نکال لی تھی یا گاڑی کے اندر ہی ہے"۔

"اب میں نے ڈُپلی کیٹ چابی جیب ہی میں رکھنا شروع کر دی ہے"۔

"فارغ ہیں تو کافی کے لیے ادھر آجائیں"۔

"اِس وقت نہیں آسکوں گا۔ میرے کچھ کلائنٹس آنے والے ہیں۔ معافی چاہتا ہوں"۔

"چلئے پھر کبھی سہی"۔
اس کے بعد ٹیلی فون پر کوئی بات نہیں ہوئی۔
لیکن عجیب اتفاق ہوا۔
شام کو جب وہ سترہ سیکٹر میں انگلش بک شاپ میں تازہ میگزنیز دیکھ رہا تھا تو انورادھا بھی اُسی سمے بک شاپ میں داخل ہوئی تھی۔
"آداب انورادھا جی"
"آداب، کونسی میگزنیز دیکھ رہے ہیں آپ؟"۔
"کچھ فیشن میگزنیز۔ میرے پروفیشن میں ان کی ضرورت رہتی ہے۔ اور آپ؟"۔
"میرا انٹرسٹ ہیلتھ میگزنیز میں ہے"۔
"پروفیشن کی وجہ سے؟"۔
"نہیں اپنی فگر کی وجہ سے"۔
اس جواب پر دونوں کا ایک بھرپور قہقہہ گونجا بُک شاپ کے اندر۔ کوشل کو لگا کہ انورادھا کی ہنسی بھی اس کی فگر کی طرح خوبصورت تھی۔
اپنے اپنے میگزنیز کے پیکٹ لیے کوشل اور انورادھا

بک شاپ سے باہر نکل آئے ۔ میگزینز کا بِل کوشل نے ادا کیا تھا ۔

اس شام دوسری بار انورادھا کوشل کے گھر آئی تھی ۔ پہلی بار تو اس شام آئی تھی جب کوشل ٹیگور تھیٹر سے اپنی گاڑی کی ڈُپلی کیٹ چابی لینے آیا تھا ۔ لیکن اس شام وہ باہر ہی سے لوٹ آئی تھی ۔ گھر کے اندر داخل نہیں ہوئی تھی ۔

کوشل کا گھر چھوٹا سا صاف ستھرا گھر تھا ۔ ایک پارٹ ٹائم نوکر تھا جو اس کا کھانا بناتا تھا اور گھر کی دیکھ بھال کرتا تھا ۔ فُل ٹائم نوکر کی اُسے ضرورت نہیں تھی کیوں کہ سارا دن تو اس کا گھر بند رہتا تھا ۔

چائے کے بعد کوشل نے انورادھا کو غزلوں کے کچھ کیسٹ سنائے اور پھر آخر میں اس نے خود فیضؔ کی مختصر سی نظم "تنہائی" گا کر سنائی ۔

تنہائی

پھر کوئی آیا دِلِ زار ! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا ، کہیں اور چلا جائے گا ؟
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار

لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذار!
اجنبی خاک نے دُھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گُل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و میناو ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مُقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!

انورادھا اس کی آواز اور اس کی اِنڈی پنیڈینٹ تِھنکنگ کی گرویدہ ہوتی گئی دھیرے دھیرے۔

یوں ہوئی تھی ابتدا کوشل اور انورادھا کی دوستی کی۔

انورادھا کو چنڈی گڑھ آئے کچھ ہیں مہینے ہوئے تھے۔ یوں تو وہ سٹیل ڈاؤن ہو گئی تھی لیکن ذہنی طور پر وہ اب بھی اُکھڑی ہوئی تھی۔ گنتی کی کچھ فیمیلیز سے اس کی جان پہچان ہوئی تھی۔ اُن سے اس کے تعلقات نہ بڑھ سکے تھے۔ ان لوگوں کی دلچسپیاں اس کی دلچسپیوں سے مختلف تھیں۔ شاید اِن کی ویلیوز بھی مختلف تھیں۔ دفتری قسم کے تعلقات جن لوگوں سے قائم رکھنے ضروری تھے، وہ سیکس کے معاملے میں کمزور تھے۔ عورت کی وہی تصویر ہر جگہ نظر آتی تھی انھیں جو انھوں نے

اپنے ذہن میں فٹ کر رکھی تھی ۔ وہ اس تصویر کو اپنے ذہن کی دیوار سے اُتار نہیں سکتے تھے ۔ یہ کمزوری شاید ہمارے سماج کی ہے ۔ صرف افراد کی نہیں ۔ سموچے سماج کا کونسیپٹ تبدیل کرنا بہت آسان کام نہیں ۔ اس عمل میں ابھی کم سے کم نصف صدی لگے گی اور نصف صدی کا انتظار کون کرسکتا ہے ؟ کم سے کم انورادھا اس کی قائل نہیں تھی ۔ اس لیے اُسنے مردوں کے بارےمیں اپنا کونیسپٹ بدلنا شروع کر دیا تھا ۔ اور آئی سولیشن کا جذبہ جو اس کی زندگی میں پہلے ہی سے موجود تھا مضبوط ہونے لگا تھا ۔ کوشل کے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا ۔

"غلط قسم کے لوگوں سے مل کر اپنا وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ تم اپنے گھر میں رہو اور پڑھو لکھو"۔

"اور اپنی فکر کا خیال کرو"۔ کوشل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا ۔

"یا سوتے رہو"۔

"اس دور میں جاگنے سے تو سونا ہی بہتر ہے"۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا دونوں کے تعلقات استوار

ہوتے گئے۔

جب کوشل نے اپنا گھر تبدیل کر کے ایک فلیٹ خریدا تو اس کی اپیرول بھی اس نے انورادھا ہی سے لی۔ اور جب بعد میں انورادھا نے اپنا گھر شفٹ کیا تو نئے گھر کا انتخاب کوشل نے کیا۔ دھیرے دھیرے ان دونوں کی شخصیتوں کی کچھ آپسی خصوصیتیں ایک دوسرے میں تحلیل ہونے لگیں۔ ایک ان ڈِی فاینڈ اور غیر واضح انڈرسٹینڈنگ ہوتی گئی دونوں میں، جسے رفتہ رفتہ ان دونوں نے بھی قبول کر لیا اور ان کے جاننے والوں نے بھی۔

انورادھا اور کوشل سوسائیٹی کی مین سٹریم میں شامل بھی تھے اور کٹے ہوئے بھی۔ ایک لطیف قسم کا امتزاج پیدا ہو گیا تھا دونوں کیفیتوں میں۔

بہر حال وہ دونوں ایک دوسرے کی دوستی کی قدر کرتے تھے اور اس پر فخر بھی!

۹

کوئی آٹھ بجے کے قریب کوشل کے فلیٹ کی گھنٹی بجی۔

نوکر نے دروازہ کھولا۔

انورادھا اور اشوک اندر داخل ہوئے۔

کال بیل کی آواز سُن کر کوشل بھی دروازے پر آگیا تھا۔اُسے بھی تو انورادھا کا انتظار تھا۔

"ہیلو انورادھا"۔

"ہیلو ڈاکٹر اشوک"۔

کوشل دونوں کو ساتھ لے کر ڈرائنگ رُوم میں آگیا۔

"میرا گھر تلاش کرنے میں تو پریشانی نہیں ہوئی"۔

"نہیں۔بس پہلے ہی روز ہوئی تھی"۔انورادھا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔جب اشوک بھی اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا تو انورادھا نے اسے مخاطب کیا"ایک دلچسپ بات بتاؤں تمہیں؟"۔

"بتاؤ دیدی"۔

کوشل نے اپنے سامنے بیٹھے دونوں مہمانوں کو دیکھا۔
دونوں ایک دوسرے کی نقل لگتے تھے۔
ایک دم کاربن کاپی۔
"شروع شروع میں میری اور کوشل کی ایک ملاقات کو چھوڑ کر تین ملاقاتیں ریسٹورینٹس ہی میں ہوئیں۔ تیسری ملاقات کے بعد کوشل نے مجھے اپنے گھر آنے کو کہا۔ کچھ لوگ چائے پر آرہے تھے اس کے ہاں"۔
میں نے گھر کا ایڈریس پُوچھا تو یہ حضرت بولے۔
"سیکٹر ۴۴"۔
"گھر کا نمبر تو ہو گا کوئی"
"نمبر جاننے کی ضرورت ہی نہیں"
"کیوں؟"
"سیکٹر چوالیس (۴۴) میں اینٹر کرتے ہی پہلی لین میں بس ایک ہی گھر ہے، جس کے باہر اشوک کے سات بہت ہی خوبصورت اور اونچے اونچے پیڑ ہیں اور ان کے ساتھ احساس سُپردگی لیے ہوئے چنبیلی کی بہت ہی گھنے پتوں والی بیل لپٹی ہے۔

سورج کے غروب ہوتے ہی بیل کی پتلی پتلی لمبی
شاخیں سفید سفید خوشبو سے بھرے پھولوں سے لد جاتی ہیں ۔
صبح سویرے سورج کی پہلی کرنوں سے بھی پیشتر میرے
گیٹ کا تمام بیرونی حصہ ان پھولوں سے اٹا ہوتا ہے ۔ جگہ جگہ
چنبیلی کے کھلے ہوئے سفید خوشبو دار پھُول ساری لین کو معطر
کر رہے ہوتے ہیں ۔ آپ صرف اشوک کے سات لمبے لمبے
درخت اور چنبیلی کے پھولوں سے بھرا گیٹ ڈھونڈتے ہوئے
میرے گھر پہونچ جائیں گی" ۔

"آپ کی نیم پلیٹ بھی تو لگی ہو گی گیٹ کے باہر؟" ۔

"میں نے نیم پلیٹ نہیں لگائی" ۔

"کیوں ؟" ۔

"نیم پلیٹ سے تمہاری پہچان نہیں ہوتی" ۔

"اور کس سے ہوتی ہے ؟" ۔

"تمہاری شخصیت میں رچی خوشبو سے" ۔

اشوک تم یقین کرو کہ میں اس شام اسی خوشبو کو تلاش
کرتے ہوئے کوشل کے گھر پہونچ گئی تھی، جس کے باہر
اشوک کے سات خوبصورت پیڑ ہاتھ جوڑے کھڑے تھے ۔ ائیر

ہوسٹس کی طرح اور جن کے پاؤں میں چنبیلی کے سفید سفید پھولوں کی چادر بچھی تھی۔

" پھولوں کی اسی چادر پر پاؤں دھرتے انورادھا اس شام میرے گھر آئی تھی۔ اُس دن انورادھا میری چیف گیسٹ تھی حالانکہ چائے کا اہتمام میں نے دہلی سے کسی مہمان کے آنے پر کیا تھا"۔

"آج میں بھی تو آپ کے گھر اسی طرح آیا ہوں"۔

"اور تم ہی چیف گیسٹ بھی ہو"۔

"ڈیڈی نہیں ہیں؟"۔

"ہر روز ایک ہی چیف گیسٹ تھوڑی ہوتا ہے"۔

تینوں کا ایک بھرپور قہقہہ کمرے کی فضا میں لہرا گیا۔

اسی لمحہ نوکر گلاسوں میں سافٹ ڈرنک لے کر ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوا تھا۔ تینوں نے اپنا اپنا گلاس اٹھا لیا اور دھیرے دھیرے سِپ کرنے لگے۔

"آج تو بے چارہ بہت پریشان ہُوا"۔ انورادھا نے اشوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کالکا میل کافی پریشان کرنے والی گاڑی ہے"۔

کوشل بولا۔

"سردیوں میں تو اس سے سفر کرنا واقعی مصیبت ہے"۔

انورادھا نے کومنٹ کیا۔

"صبح سویرے پہونچتے ہی تم پی جی آئی کیوں چلے گئے؟"

"جانے میں تکلیف تو ہوئی لیکن ایک بہت ضروری فارمیلٹی پوری ہو گئی۔ ورنہ تمام دن پریشان ہوتا"۔

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ سُورت سے کسی بھی آنے والے آدمی کو اب لوگ موت کا فرشتہ سمجھتے ہیں۔ ہر شہر میں یہی حال ہے۔ میں ابھی دو دن پہلے انورادھا کو دہلی کے کچھ واقعات سنا رہا تھا۔ پلیگ نے تو ہمارا ویلیو سسٹم ہی برباد کر ڈالا ہے۔ اب تو میاں بیوی بھی ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں"۔

" آج سے لوگ چنڈی گڑھ میں بھی ڈرنے لگے ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی ہیں"۔

انورادھا بولی

"بھئی تمہارا ڈیپارٹمینٹ ہے۔ تم جانو"۔

تینوں نے اپنے اپنے خالی گلاس سامنے پڑی تپائی پر

رکھ دیئے۔

کھانے میں ابھی دیر تھی۔

"ایک ایک ڈِرنک ہوجائے؟"۔ کوشل نے اشوک سے پُوچھا۔

"نہیں مجھے تو گرم گرم کافی پلا دیجئے"۔

"وٹ اباؤٹ یُو انورادھا؟"۔

"کافی"۔

"اب میں کیا کروں؟"۔ کوشل نے سوال کیا۔

"تم اپنی ڈِرنک لو"۔

یہ کہہ کر انورادھا کچن میں چلی گئی۔ وہ کافی اپنے ہاتھ ہی سے بنا کر پیتی تھی۔ اس نے اپنے اور اشوک کے لیے کافی بنائی۔ کوشل اپنی ڈِرنک لے کر ڈرائنگ روم ہی میں آگیا۔

انورادھا اور اشوک نے اپنی اپنی پیالیاں اوپر اٹھائیں اور چیرز کی آواز بلند کی۔ کوشل نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ لیتے ہوئے ڈاکٹر اشوک سے کہا۔

"چنڈی گڑھ میں یہ تمہاری پہلی وِزِٹ ہے ڈاکٹر؟"۔

"آپ مجھے اشوک کہہ کر ہی مخاطب کیجئے۔ مجھے اچھا لگے

گا"

"تو میرے سوال کا جواب دو"۔

"ایک طرح سے میری یہ پہلی ہی وزٹ ہے یہاں۔ بہت برس پہلے صرف ایک دن کے لیے آیا تھا جب میڈیکل کالج میں ایڈمشن کا چکر تھا۔ کہیں بھی نہیں جاسکا تھا تب"۔

"ان دنوں تو میں بہت پریشان ہوئی۔ بڑی مشکل سے روپیوں کا انتظام کیا۔ کالج والوں کو تو ڈونیشن چاہیے تھی۔ جو زیادہ روپے دے وہ ایڈمشن لے لے۔ میرٹ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا"۔

"میرٹ کو تو اب بھی کوئی نہیں پوچھتا دیدی"۔

"آئندہ بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ ابھی حالات اور بگڑیں گے اشوک۔ پہلے صرف سیاسی لوگ لوٹتے تھے اب بیورو کریٹس بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ عام آدمی اس دوطرفہ حملے میں تو پوری طرح کچلا جارہا ہے۔ کون سی جگہ ہے جہاں عام آدمی کی پہونچ ہے؟"۔

"میرے خیال سے تو کوئی بھی نہیں"۔

"کیا رہے گا تمہارا پروگرام یہاں؟"۔

"اس نے چنڈی گڑھ دیکھا ہی کہاں ہے - جی بھر کر گھماؤں گی اُسے - ایک دن کے لیے شملہ بھی لے جاؤں گی - ہی نیڈزا سے چینج" - انورادھا نے کہا -

"آئی ایگری وِتھ یُو - اشوک تم بتاؤ کہ آخر سُورت میں اچانک کیوں پلیگ کی وبا پھیل گئی؟" -

"بہت ظلم ہوا کوشل صاحب - مرے یہاں بھی غریب اور بے سہارا لوگ ہیں - جو کچھ میں نے دیکھا ہے اسے بیان کرنا بھی مشکل لگتا ہے" -

"میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں" -

"تو سُنیے" -

سُورت کو "ہیروں کا شہر" کہا جاتا ہے - اس شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ دُنیا میں کچّے ہیرے سب سے زیادہ مقدار میں یہیں تراشے جاتے ہیں - اس کے علاوہ ہندوستان میں چھوٹے پیمانے کی کپڑوں اور ساڑیوں کی صنعت کا یہ سب سے بڑا مرکز ہے - یہاں تقریباً بیس ہزار کے قریب چھوٹے اور بڑے کارخانے ہیں - فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی بڑی تعداد اردگرد کے علاقوں میں بھری پڑی ہے - دراصل یہ شہر پچھلے دو

سالوں میں کسی نہ کسی آفت کا شکار ہوتا رہا ہے ۔ پہلا سانحہ تو یہاں اجودھیا کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد بد ترین فسادات کی شکل میں پیش آیا ۔ دوسرا سانحہ تاپتی ندی میں آیا .بھیانک سیلاب تھا' جسکی لپیٹ میں آنے کے بعد یہ شہر ایکدم تباہ ہوگیا۔ نمونیائی پلیگ کی وبا کا بہت بڑا سبب بھی ' یہ سیلاب اور اس کا خطرناک ردّ عمل تھا' جس سے خاص طور پر وہ علاقے متاثر ہوئے' جہاں زیادہ تر اقتصادی طور پر پچھڑے ہوئے لوگ رہتے ہیں ۔ جس شہر میں دن رات ٹرکوں اور چرخوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور ہیروں کی جگمگاہٹیں دکھائی دیتی تھیں وہاں اب موت کا سناٹا چھانے لگا تھا۔ ریشم کے تاجر اور کاریگر شہر سے بھاگنے لگے تھے ۔سُورت کے شہریوں نے اس کا ذمہ دار باہر سے آئی ہوئی آبادی کو ٹھہرایا ' خاص طور پر وہ جو مہاراشٹر کے علاقے لاتور اور اس کے گرد و نواح کے دیہات کے خوفناک زلزلے کے بعد اپنے اپنے گھر چھوڑ آئے تھے اور ان بھرے پرے گھروں کو جنگلی چوہوں نے اپنا مسکن بنا لیا تھا ۔ انہی چوہوں کے پسو یہاں پلیگ کی وبا کو پھیلانے کے ذمہ دار تھے ۔سُورت میں رہنے والے لوگوں کو باہر سے آئے ہوئے

انھیں لوگوں کے خلاف بے حد غصہ تھا۔ اس کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب مقامی لوگوں نے کٹار گم اور ویدروڈ والے علاقوں میں دو کلینکوں میں توڑ پھوڑ مچائی اور انھیں پھونک ڈالا، کیوں کہ ان کے مالک "غیرسورتی" ڈاکٹر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ افواہ تھی کہ سورت شہر کو چھوڑ کر بھاگ جانے والے ایسے پیرائیویٹ ڈاکٹروں کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار تھی۔

"بڑا ہی غیر اخلاقی عمل تھا"۔ کوشل بولا

"لیکن ہوا یہی ہے کوشل صاحب"۔

"اس اتنی بڑی ٹریجڈی کی شروعات کیسے ہوئیں"۔

"رپورٹس کے مطابق تو ضلع بیڈ کے گاؤں مالا میں پچیس اگست کو پلیگ کا پہلا کیس ہوا۔

تھوڑے ہی دنوں میں پلیگ کے کیسوں کی تعداد ایک سو سات ہو گئی، جس میں سے کچھ مریض مر بھی گئے۔ اس علاقے کے ہیلتھ انسپکٹر مکیش وچنکر کے مطابق جو مالا گاؤں سے کچھ ہی کلو میٹر کی دوری پر کپا پرائمری ہیلتھ سینٹر میں تعینات تھا، جب بیڈ کے ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفس میں یہ رپورٹ پہونچی کہ وہاں بڑی تعداد میں چوہوں کے مرنے کی وجہ سے

سارے گاؤں میں پسو پھیل گئے تھے، تو وہ مالا گاؤں میں پھونچا اور پسوؤں کی تلاش کرنے لگا تو اچانک اس نے دیکھا کہ اس کی تمام پتلون پسوؤں سے بھر گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی ہیڈ آفس میں رپورٹ کر دی لیکن خاطر خواہ ! انتظام نہ کیا گیا۔ اگر گورنمنٹ لیول پر فوراً ہی ایکشن لیا جاتا تو اس ٹریجڈی کو روکا جاسکتا تھا"۔

"تو سرکار نے کچھ نہیں کیا؟"۔

"کچھ زیادہ نہیں۔ بیڈ میں جہاں پلیگ کے پہلے پہلے کیس سامنے آئے، اس ضلع کے دیہات میں ہر طرف برف کی مانند پیسٹی سائیڈ سپرے کو پھیلا دیا گیا۔ گورنمنٹ ہاسپٹل میں ایک آئی سولیشن وارڈ بھی کھول دیا۔ جہاں دو سال کی بچی اشونی کدم پلیگ ہوجانے سے بخار میں پھکتی ہوئی تڑپ رہی تھی اور لوگ دور کھڑکیوں کے باہر کھڑے اس کے مرنے کا تماشہ دیکھ رہے تھے"۔

"اور تم نے یہ سب کچھ دیکھا ہے؟" انورادھا نے پوچھا

"سورت کے باہر تو جو کچھ ہوا اس کے بارے میں تو صرف سنا ہے لیکن جو کچھ سورت میں ہوا اسے بہت قریب سے

دیکھا ہے اور جھیلا بھی ہے۔"

"آئی نو۔" کوشل نے ایک ہی بار دو لمبے گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا اور اشوک کی کافی کی پیالی سامنے پڑی ٹھنڈی ہوتی رہی۔ اس کی طرف کسی کی بھی توجہ نہ تھی۔

"۲۱ ستمبر کو سورت میں پلیگ کے پہلے کچھ کیس ہوئے اور اگلے ہی دن ان کی تعداد ستر (۷۰) ہوگئی۔ ادھر دہلی میں جب یہ خبریں پہونچیں تو ریڈ الرٹ کا اعلان کر دیا گیا۔"

"وہ تو ہونا ہی تھا۔" انورادھا طنزاً ہنسی۔

"ڈیڈی، دو ہی دن میں لاکھوں لوگ شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے۔ ٹرینیں، بسیں، ٹیکسیاں لوگوں سے لدی تھیں۔ بسوں اور ٹیکسیوں کے کرائے دس گنا ہوگئے تھے۔ کئی فیملیز تو اپنے سکوٹروں پر ہی لد کر شہر چھوڑ رہی تھیں۔ میں نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر تو میرا دل دہل گیا تھا۔ شہر میں قیامت کا سماں تھا۔ سورت کو "طاعون زدہ شہر" قرار دے دیا گیا تھا۔ لوگوں کی مانگ تھی کہ تمام شہر کو فوج کے حوالے کر دیا جائے۔ ماحول میں خوف ہراس اس شدت سے پھیل گیا تھا کہ پڑوسی بھی ایک دوسرے سے ڈرنے لگے تھے

کسی کو کسی پر وشواس نہ رہا تھا ۔ ہر شخص اپنی منہ پر کپڑا لپیٹے ایسے لگ رہا تھا کہ اس نے کسی مرنے والے کے کفن کا کوئی ٹکڑا اپنی شخصیت کے ساتھ چمٹا لیا ہو ۔ لگتا تھا جیسے شہر میں ہر آدمی موت کا پیغام لئے پھر رہا تھا اور اس مقام سے جہاں وہ اس وقت کھڑا تھا ۔ کہیں اور بھاگ جانے کی کوشش میں تھا ۔"

اتنا کہہ کر اشوک خاموش ہوگیا ۔ اُس سے اور نہ بولا جا رہا تھا

"سُنا ہے دو ڈاکٹر بھی پلیگ سے مر گئے تھے ۔"

"جی ہاں ۔ ان کی موت ہی سے تو لوگوں کا حوصلہ ٹُوٹا تھا ۔ لوگ سوچنے لگے کہ ڈاکٹر اگر خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو وہ بیماروں کی کیا حفاظت کریں گے ۔ ان ڈاکٹروں کی موت سے لوگوں کا تو حوصلہ کمزور ہُوا ہی ' اس کے ساتھ خود ڈاکٹر بھی گھبرا گئے ۔ ان میں بھی اِن سیکیورٹی کا احساس بُری طرح سے اُبھر آیا ۔ دوائیوں کی بھی کمی تھی شروع شروع میں ۔ ڈاکٹروں کا یہ پہلا تجربہ تھا ۔ لوگوں میں سنسنی پھیلتی جارہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور ڈاکٹر دونوں ہی ڈر گئے ۔ سُورت میں اتنا بڑا حادثہ اس سے پہلے کبھی ہُوا بھی تو نہیں تھا ۔" اشوک ایک لمبا

سانس لے کر خاموش ہو گیا۔
"میں سمجھتی ہوں لوگ گھبرا بھی گئے تھے ۔ اور ڈر بھی گئے تھے ۔" انورادھا بولی
"گھبراہٹ تو دراصل ڈر ہی کا ایک ردِّعمل ہے، انورادھا ۔ آدمی جب ڈر جاتا ہے تو اس کے سوچنے اور عمل کرنے کی صلاحتیں سلب ہونے لگتی ہیں اور اپنے آپ پر اسکی گرفت کمزور ہونے لگتی ہے ۔ ۔ بیماری کا تو علاج ہے لیکن ڈر کا کوئی علاج نہیں ۔ ڈر اپنے آپ میں ایک بہت بڑا ایپی ڈیمِک ہے ۔ ڈر بھی ایک طرح سے چُھوت کی بھیانک بیماری ہے ۔ایک کو ہوجائے تو پھر آگ کی طرح پھیلتی ہے ۔ اور ایک ہی بار ان گنت لوگ اس کی زد میں آجاتے ہیں ۔ ڈر کر لوگ دیواریں پھلانگنے لگتے ہیں ۔ چھتوں سے کُود جاتے ہیں ۔ چلتی ریل کے ڈبوں سے چھلانگیں لگا دیتے ہیں ۔سنیما گھروں کے دروازوں سے باہر نکلتے ہوئے بِھیڑ میں کچلے جاتے ہیں ۔ مائیں بچوں کو چھوڑ دیتی ہیں۔ بھائی بہنوں سے خطروں میں الگ ہوجاتے ہیں ۔ خوف کی زد میں آکر تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے ۔"
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے اب تو اس کا ذاتی تجربہ

ہو گیا ہے۔" اشوک نے حامی بھری

"کیا یہ بھی سچ ہے کہ سورت سے ڈاکٹر بھی بھاگ گئے تھے؟" انورادھا نے سوال کیا

"یہ خبر بھی سچی ہے ۔ پہلے پہل تو غیر سورتی ڈاکٹر ہی بھاگے تھے۔ لیکن بعد میں وہاں کے کچھ سرکاری ڈاکٹروں نے بھی شہر چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔"

"شہر چھوڑنے والے ڈاکٹروں میں، زیادہ تعداد کن کی تھی؟"

"زیادہ تعداد انہی ڈاکٹروں کی تھی جو کمزور تھے اور جنہیں کوئی مارل سپورٹ نہیں تھی۔

کوشل صاحب، انسان کو زندگی میں مارل سپورٹ کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر سے اُن لمحوں میں جب کوئی بڑا کرائسس اُس کے سامنے ہو۔ اُس وقت اُسے کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے، جو اُس سے بڑی ہو، اور مضبوط ہو اور بھروسے کے قابل ہو۔ ورنہ کرائسس کے لمحوں میں انسان ٹوٹ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اس بری طرح سے ٹوٹتا ہے کہ پھر کبھی سالم ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمھارا تجزیہ ٹھیک ہے ۔"

"شہر چھوڑ کر بھاگنے والے مقامی ڈاکٹروں میں زیادہ وہی تھے جنہیں مارل سپورٹ دینے والا کوئی نہیں تھا ۔"

"تم بھی سُورت سے ڈر کر ہی بھاگے ہو؟"

"جی ہاں ۔ بُری طرح سے ڈر کر ۔"

"کِس سے ڈر کر؟"

"موت سے، کوشل صاحب ۔"

"اگر شانتی اگروال نہ مرتی، تو پھر بھی تم سُورت چھوڑ دیتے ؟" انورادھا نے سوال کیا

"ڈِیدی، پھر میں سُورت نہیں چھوڑتا ۔ وہیں رہتا اور غریب اور بیمار لوگوں کی خدمت کرتا ۔ شانتی کی موت نے مجھے ایکدم اپاہج کردیا ۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی ۔ میں ایک دم بے سہارا ہو گیا ۔ میں ایک ایسا درخت ہو گیا، تیز آندھی نے جس کی ساری جڑیں اکھاڑ دی تھیں اور وہ کسی بھی کھشن زمین پر گِر سکتا تھا ۔ اگر میں گر جاتا تو ختم ہوجاتا ۔ اُس وقت ڈِیدی، مجھے صرف تمھارا خیال آیا ۔ ایک تم ہی تھیں جو مجھے فنا ہونے سے بچا سکتی تھیں اور میں بھاگ آیا تھا تمھارے پاس ۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے اشوک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
انورادھا نے اپنی جگہ سے اٹھکر اشوک کا سر اپنی باہوں
میں لے کر اسے اپنے ساتھ سٹا لیا اور بولی
"میں تو شروع ہی سے تمہیں سہارا دیتی رہی ہوں '
اشوک ۔"

"اور میں سلامت بھی شاید اسی لئے رہ سکا ۔ ورنہ ایک
یتیم لڑکا تو کب کا ختم ہو گیا ہوتا ۔ دِیدی میری ساری زندگی پر
تمہارا احسان ہے ۔ یہ احسان میں اس زندگی میں تو نہیں اُتار سکتا"
اس نے اپنی دونوں باہوں سے انورادھا کے جسم کو جکڑ لیا ۔
کوشل انسانی رشتوں کے اس رُوپ کو دیکھکر خاموش نہ
رہ سکا۔

"انورادھا کو تم بہت پیار کرتے ہو ! "
"جی ہاں ۔ کوشل صاحب ۔"
"شانتی اگروال سے بھی زیادہ ؟ "
"اب اس سوال کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی ۔" اشوک
نے اپنی باہیں انورادھا کے جسم سے الگ کیں اور اپنی گیلی
آنکھوں کو رومال سے پونچھ لیا ۔

انورادھا بھی اس سے الگ ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی ۔
کوشل لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد بولا
"کرائسس کے گھنٹوں میں، پیار سے زیادہ کوئی مضبوط
سُتون نہیں ہوتا ۔"
"آپ کو بھی تجربہ ہے اس کا، کوشل صاحب ؟"
"بہت گہرا تجربہ ہے مجھے، اشوک ۔ میری زندگی کی
تمام عمارت انہی سُتونوں کے سہارے کھڑی ہے ۔ ورنہ کب کی
گِر گئی ہوتی ۔"
"پیار بھی تو کئی قسم کا ہوسکتا ہے کوشل صاحب ۔"
"صرف کمزور آدمی ہی اس طرح سوچتے ہیں ۔"
"اپنی بات کی وضاحت کرو، کوشل ۔ یہ جواب بہت
مختصر ہے ۔" انورادھا بولی
کوشل انورادھا کی بات پر ہنسا اور پھر بولا
"پیار کی وضاحتیں کہاں ہوسکتی ہیں ۔ خوشبو تو صرف
خوشبو ہے ۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ۔"
"پیار بھی تو کئی قسم کا ہوسکتا ہے کوشل صاحب ۔"
"پیار کی کوئی قسم نہیں بھائی ۔ پیار صرف پیار ہے ۔

اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ۔ پیار یا تو ہے یا پھر بالکل نہیں ۔
پیار کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ۔"

"میں ایک بڑا غلط سا سوال کر رہا ہوں ۔ بُرا نہیں مانیے گا"

"یہ تو خود غلط سوال کرنے کے لئے بدنام ہے ۔ بُرا
کیوں مانے گا ۔" انورادھا نے کمینٹ کیا

"تم سوال کرو ۔" کوشل نے مسکراتے ہوئے کہا "سوال
غلط بھی ہو گا تو جواب صحیح دوں گا، مطمئن رہو ۔"

"کیا آپ ڈیڈی سے پیار کرتے ہیں ؟"

یہ سوال سن کر انورادھا ذرا سی گھبرا گئی ۔ لیکن بولی
نہیں ۔ صرف اشوک کو دیکھتی رہی

"تمھارا کیا خیال ہے ۔"؟

"میں نے سوال کیا ہے، آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ
میری رائے جانیں ۔"

کوشل نے قہقہہ لگایا

"اِن ٹیلی جینٹ آدمی ہو ۔"

"تھینکس فار یور اسیسمینٹ ۔"

"بولو بھائی کیا جواب دوں ؟" کوشل نے انورادھا کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا
انورادھا شرما گئی - اس کی' آنکھیں جُھک گئیں
"سوال تم سے ہے' مجھ سے نہیں"
"ہم دونوں سے ہے' کیوں اشوک ؟"
"سوال صرف آپ سے ہے' حضور -"
تاش کھیلتے ہو؟"
"کھیلتا ہوں -"
"تو کل شام تاش کی محفل جمے -"
"منظور -"
"مجھے بھی تمھارا سوال منظور ہے - میں تمھاری دیدی سے پیار کرتا ہوں "
یہ کہتے ہوئے کوشل اپنی جگہ سے اٹھا اور شرماتی ہوئی انورادھا کو اپنے بازؤں میں لیکر اسے چُوم لیا -
اشوک دونوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا
کوشل نے اپنا ایک ہاتھ اشوک کے ہاتھ میں دیا اور پھر اسے اُٹھا کر اپنے بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے بولا
"تم ایک ایماندار' ذہین اور اس لمحہ بُری طرح ٹُوٹے

ہوئے نوجوان ہو۔ تم نے خود پیار کیا ہے اور اس رشتے کی
مہانتا کو جانتے ہو۔ میری اور انورادھا کی ایک گہری پرسنل انڈر
سٹینڈنگ ہے اور ہم دونوں کو اس پر فخر ہے۔"

"آئی انڈرسٹینڈ کوشل صاحب۔"

میں نے پیار کے بارے میں ANTOINE DE
SAINT کی دو لائینز کہیں پڑھی تھیں۔ انہیں نوٹ کرلو،
تمھارے کام آئیں گی۔

Love does not consist in gazing at each other,

But Looking outward together in the same direction.

اشوک اپنی جیب سے چھوٹی سی ڈائری نکال کر یہ لائینز لکھنے لگا
اور انورادھا نوکر کی مدد سے کھانے کی میز پر پلیٹیں لگانے میں
مصروف ہو گئی۔

کھانا تو نوکر نے کب کا تیار کر دیا تھا۔

۱۰

کھانے کے بعد جب کوشل ' اشوک اور انورادھا کو انورادھا کے فلیٹ پر چھوڑنے آیا تو اشوک نے اِصرار کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اوپر آجائے اور ان کے ساتھ ایک پیالی کافی پی لے ۔ کافی کوشل کی سب سے بڑی کمزوری تھی ۔ اِس آفر کو وہ کبھی نہیں ٹھکراتا تھا ۔ اس نے گاڑی کو لاک کیا اور انورادھا کے فلیٹ پر آگیا۔

"دِیدی اگر اجازت دو تو میں کافی بناؤں ؟"

"تم بنادو ۔ مجھے کیا اعتراض ہے ۔"

"شانتی اگروال نے ہی مجھے کافی بنانی سکھائی تھی ۔ اس کی بنائی ہوئی کافی کا تو خیر جواب ہی نہیں ہوتا تھا ۔"

انورادھا اور کوشل ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ گئے اور اشوک کچن میں کافی بنانے لگا

"اشوک اچھا لڑکا ہے ۔" کوشل نے کہا

"اس کی شادی کسی اچھی لڑکی سے ہوجائے اور وہ خوش رہے ' یہی میری تمنّا ہے ۔"

"کوئی بھی اچھی لڑکی اسے پسند کرے گی۔"

"لیکن ابھی تو وہ ذہنی طور پر بڑا ڈی پریسڈ ہے۔ تم چنڈی گڑھ میں کوئی لڑکی دیکھو پھر اس سے بات کروں گی۔"

"میرے خیال سے اشوک بھی اب زیادہ عرصہ سُورت میں رہنا نہیں چاہے گا۔"

"وہاں تو وہ کانتی بھائی کی وجہ سے ہی ہے۔ پھر شانتی سے اس کا سمبندھ ایک اور کارن بن گیا اس کے وہاں رہنے کا۔ اب تو شاید سُورت سے اتنی کمٹمینٹ نہ رہے اُس کی۔"

"ہوسکتا ہے۔ اِٹ اِز ٹُو ارلی ٹُو تھِنک اباؤٹ اِٹ۔"

گفتگو کے دوران ہی اشوک ٹرے میں کافی کی پیالیاں رکھ کر ڈرائنگ رُوم میں آگیا

انورادھا اور کوشل نے کافی کا ایک ایک گھونٹ لیا اور دونوں ہی ایک ساتھ بولے

"ونڈرفُل کافی۔"

"چلو میں اور تم چنڈی گڑھ میں ایک کافی بار کھولتے ہیں۔" اشوک نے مسکراتے ہوئے کہا

"میں کسٹمرز کے بل کاٹ دیا کروں گی۔" انورادھا نے

پیش کش کی۔

اور پھر تینوں کے ملے جلے قہقہوں نے ڈرائنگ روم کا ماحول نکھار دیا

"میں ایک بات سوچ رہا تھا اشوک ۔"

"فرمائیے"

"ڈاکٹروں کا بھی کوڈ آف کانڈکٹ ہوتا ہے نا ؟"

"وہ تو ہر پروفیشن میں ہوتا ہے، کوشل صاحب ۔ لیکن اکثر لوگ اس کا خیال نہیں کرتے ۔"

"چور تو بہت خیال رکھتے ہیں اس کا ۔"

"اپنی برادری کے بارے میں تو تم ہی زیادہ جانتے ہو ۔" انورادھا نے کوشل کو چھیڑا

"دھیرے دھیرے تم بھی میری برادری ہی میں شامل ہورہی ہو ۔"

"ویل سیڈ ، کوشل صاحب ۔" اشوک نے ہنستے ہوئے کہا "پچھلے دنوں اخباروں اور میگزینز میں کِڈنیز (گردوں) کے ریکٹ کا بڑا چرچا تھا ۔ اس ریکٹ میں بنگلور اور میسور کے ڈاکٹر بھی شامل ہیں ۔ اپنے پروفیشن کے بارے میں اتنی بے

ایمانی۔ پروفیشنل کانڈکٹ کی کیا اہمیت رہ گئی پھر؟"
"میں نے بھی اس ریکٹ کے بارے میں پڑھا ہے۔
بلکہ میں خود بھی کرناٹک گیا تھا۔"
"تم کیسے گئے تھے؟"
"دراصل ڈاکٹر کانتی بھائی اپنے مدر ٹریسا ہاسپٹل میں نیفرا لوجی ڈی پارٹمینٹ کھولنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے مدراس اور کرناٹک بھیجا تھا کہ میں مختلف ہاسپٹلز میں جا کر اس ڈیپارٹمینٹ کو دیکھوں۔ مشینری کی ورکنگ کو سٹڈی کروں۔ پھر ہم صلاح مشورہ کریں گے۔"
"میں نے واپس آ کر کانتی بھائی کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے ہاسپٹل میں نیفرالوجی ڈیپارٹمینٹ نہ کھولے۔"
"کیوں؟"
"کڈنی ٹرانسپلانٹیشن کا تو ایک پورا کاروبار چل رہا ہے۔ مدراس کے قریب ایک جگہ ولی وکم ہے جہاں کڈنیز بیچنا، کاٹیج انڈسٹری بن گیا ہے، خاص طور سے بھارتی نگر کی لوکیلٹی کے دو ہزار لوگوں میں سے چار سو لوگ صرف ایک کڈنی کے سہارے زندہ ہیں۔ اس لوکیلٹی کے ایک آدمی تھیا گراجن نے بتایا کہ وہ

قرضے میں بُری طرح پھنس گیا تھا ۔ ایک دلال نے اسے بیس ہزار روپے دلوا کر اس کی ایک کِڈنی نکلوادی ۔ تھیاگراج نے اپنا قرضہ بھی چُکا دیا اور اپنی پھوس کی ایک جھونپڑی بھی بنالی ۔ تھوڑے دنوں بعد اس کی جھونپڑی کو آگ لگ گئی اور وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی ۔ اس دوران تھیاگراج جو تگڑے جسم کا آدمی تھا دھیرے دھیرے کمزور ہوتا گیا اور محنت مزدوری کرنے کے بھی ناقابل ہو گیا ۔ انجام کے طور اس کی دونوں بیویوں، تِھلکا اور تُلسی کو بھی اپنی ایک ایک کِڈنی بیچ دینی پڑی ۔ اب تھیاگراج اور اس کی دونوں بیویاں بالکل محتاج اور بے سہارا ہو گئی ہیں ۔ ایروڈ ضلع میں تو ایک کالونی انائے رتھیا کالونی کے نام سے ہے جس کو لوگ کِڈنی بازار کہنے لگے ہیں ۔"

"بنگلور میں تو ایک ہاسپٹل بھی ہے جو اس کام کے لئے بہت بدنام ہے ۔"

"جی ہاں ۔ اس کا نام ہے یلما داسپا ہاسپٹل ۔ ایک دوسرا ہاسپٹل بھی ہے ۔ وکٹوریہ ہاسپٹل ۔ اس ریکٹ میں تین ڈاکٹر بھی شامل ہیں ۔ ڈاکٹر عادل احمد، ڈاکٹر سدا راجو اور دلیپ پٹیل ۔"

"وکٹم کون ہیں اس ریکٹ کے ؟" انورادھا نے پوچھا

"وہی غریب اور محتاج لوگ جو ہر جگہ ایکسپلایٹ ہوتے ہیں ۔ ابھی دوسال پہلے جب پولیس میں اس قسم کی رپورٹیں پہونچیں تو دو ڈاکٹر گرفتار بھی کر لئے گئے ۔ دلیپ پٹیل پولیس کے قابو میں نہیں آیا ۔ جن دو آدمیوں نے پہلے پہل پولیس کو رپورٹ دی ان میں سے ایک کے ۔ وِلو نام کا قُلی تھا۔"

"تفصیل بتاؤ گے قُلی کے کیس کی ؟" کوشل نے کہا

"بتاتا ہوں ۔ سُنیئے"۔

— وِلو قُلی ایروڈ ضلع کے پلی پلایم میں چھکڑا چلانے کا کام کرتا تھا ۔ اس سے پہلے وہ بنگلور کی کے ۔ آر مارکیٹ میں مزدوری کرتا تھا اس کی بد نصیبی کا آغاز اس دن ہوا جب اس کی ملاقات ایروڈ میں محمد یوسف اور محمد حنیف درزی سے ہوئی ۔ محمد یوسف تامل ناڈو سے بنگلور میں کنسٹرکشن ورک کے لئے مزدور لاتا تھا اور انہی کو وہ کڈنی بازار میں استعمال کرتا تھا ۔ غریب وِلو قُلی کو اس بات کا علم نہیں تھا ۔ یوسف اور حنیف نے وِلو قُلی سے کہا کہ وہ ان کی ساتھ بنگلور چلے ' وہاں وہ اسے اچھا کام دلوادیں گے ۔ وِلو اپنے بیوی بچّوں کو چھوڑ کر یوسف اور حنیف کے ساتھ بنگلور آگیا ۔ یوسف نے اسے اپنے گھر میں ٹھہرا دیا

جہاں پانچ جوان آدمی پہلے ہی سے موجود تھے ' جو ایروڈ سے یوسف کے کہنے پر یہاں آئے ہوئے تھے ' اس بھروسے پر کہ یوسف اُنہیں بنگلور میں کوئی اچھا کام دِلوا دے گا ۔ کوئی دو مہینوں کے بعد یوسف نے وِلو قلّی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنا خون بیچ دے اور ان روپیوں سے کچھ دن اپنا گزارہ چلائے ۔ اس دوران وہ اسے کہیں کام دِلوادے گا ۔ وِلو رضا مند ہو گیا ۔ یوسف اسے پہلے آنند ڈایا گنا سٹک لیبارٹری اور پھر میڈی نو ڈایاگناسٹک سینٹر میں ٹیسٹ کرانے کے لئے لے گیا ۔ دونوں جگہوں سے وِلو کو پانچ پانچ سو روپے مل گئے ۔

اس دوران یوسف اور حنیف نے وِلو قلّی کو ڈاکٹر سیّد عادل احمد سے متعارف کرایا جو پچھلے دس برسوں سے لیبیا اور سعودی عرب میں کام کررہا تھا ۔ یوسف اور حنیف نے ڈاکٹر عادل کو 'باس' کہہ کر متعارف کرایا اور وِلو سے کہا کہ اس کا خون بیچے جانے کے قابل تھا اور اس کے ٹیسٹ ٹھیک رہے تھے ' بعد میں وہ اسے بیلما داسپا ہاسپٹل لے گئے جہاں انہوں نے اسے ڈاکٹر سیداراجو اور ڈاکٹر دلیپ پٹیل سے مِلوایا ۔ اور انہوں نے کورے کاغذوں پر وِلو کے دستخط کروالئے ۔

"اچھی خاصی سازش تھی یہ۔"

"ڈیڈی ابھی اور سنو

" ڈاکٹروں نے اسے میز پر لٹا دیا اور اسے ایک انجکشن دیا اور اُس سے کہا کہ وہ اب اُس کا خون نکالیں گے۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بائیں طرف پٹی بندھی تھی۔ پوچھنے پر جواب ملا کہ انہوں نے اس کی کمر سے خون نکالا تھا۔ کیوں کہ اُنہیں زیادہ خون چاہیے تھا اس لئے ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑا تھا۔

وِلو بے چارے کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کی ایک کِڈنی نکال دی گئی تھی اور اسے بہت بڑی قیمت پر ایک غیر ملکی باشندے کو فروخت کردیا تھا۔"

"ہاؤ سیڈ۔" کوشل نے دُکھ بھری آواز میں کہا

"وِلو بے چارے کو تو اس آفت کا علم کئی مہینوں کے بعد ہوا جب وہ آپریشن کے بعد دَس ہزار روپے لیکر پلی پلایم واپس آگیا تھا۔ ہوا یہ کہ اسے بائیں پہلو میں چوٹ لگ گئی اور جب وہ زخم دکھانے کے لئے ایک ڈاکٹر کی پاس گیا تو ڈاکٹر نے آپریشن کے بعد کے بڑے سے نشان کو دیکھ کر وِلو کو بتایا کہ

ڈاکٹروں نے اس کی کِڈنی نکال لی تھی - وہ فوراً بنگلور جا کر
یوسف اور حنیف سے ملا اور اُنہیں دھمکایا - انہوں نے اس کو
بُری طرح ڈانٹا اور نکال دیا - اس کے بعد وہ ایک سماجی کار کن
سے ملا اور اسکی مدد سے ایک وکیل کی طرف سے ڈاکٹر عادل پر
پانچ لاکھ روپے کا ہرجانہ کا دعوے کیا - پھر اس نے پولیس
میں بھی رپورٹ درج کرائی اور پولیس نے ڈاکٹروں کو حراست
میں لے لیا - "

"اس کے بعد کیا ہوا ؟ "

اس دوران چار اور کیس پولیس والوں کے نوٹس میں
آئے جن میں آنند نام کا ایک انجینیر بھی تھا-انکشاف یہ ہوا کہ
حنیف کو ہر کیس کا تین ہزار روپیہ ملتا تھا اور یوسف کو ایک
ہزار - ڈاکٹر لوگ آپس میں لاکھوں روپے بانٹتے تھے - "

"ڈاکٹروں کا کیا ہوا؟ "

" کچھ بھی نہیں - کرناٹک میڈیکل کونسل نے ڈاکٹر
عادل اور سِداراجُو کو ایک سال کے لئے معطل کر دیا - اور بس -
معاملہ ابھی تک کورٹ میں لٹک رہا ہے - اور کِڈنی مارکیٹ شکل
بدل بدل کر اپنا کاروبار کر رہی ہے - "

"اور ان غریبوں کا کیا ہو رہا ہے جن پر یہ ظلم ڈھایا گیا ہے ؟ ۔"

"دیدی کڈنی کی بیماریوں سے یہ لوگ مرتے جا رہے ہیں اور ان کا حال پوچھنے والا کوئی نہیں ۔

بھارتی نگر کالونی کے لوگ تو یہ سوچ سوچ کر کانپتے ہیں کہ اگر ان کی بچی ہوئی ایک کڈنی بھی فیل ہو گئی تو ان کا کیا حشر ہو گا ؟"

"تو یہ ہے ڈاکٹروں کے کوڈ آف کانڈکٹ کا حال !" کوشل نے کہا ۔

"یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ آنے کے بعد میں نے ساری داستان ڈاکٹر کانتی بھائی کو سنادی ۔ یہی فیصلہ ہوا کہ مدر ٹریسا ہاسپٹل میں نیفرالوجی کا ڈیپارٹمینٹ نہیں کھولا جائے گا ۔ ہم انسان کے جسم کے حصّے بیچنے کا کاروبار نہیں کرسکیں گے ۔"

"شانتی کا بھی یہی خیال تھا ؟"

"اس کی بھی یہی رائے تھی ، دیدی ۔"

"من اداس ہو گیا تمھاری باتیں سن کر اشوک ۔ آئی ایم سوری میں نے تم سے غلط موضوع پر بات شروع کر دی ۔"

"جب سارے سماج کا ڈھانچہ ہی غلط ہے تو آپ بات کرنے کے لئے صحیح موضوع کہاں سے لائیں گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

تھوڑی دیر کے بعد کوشل نے جانے کی اجازت چاہی۔

انورادھا اور اشوک اسے نیچے تک چھوڑنے گئے۔

رات کے بارہ بجنے کو تھے۔

انورادھا کے کمرے میں ایک ہی بیڈ تھا۔ دوسرے بیڈ کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ اشوک کا بستر اس نے دوسرے کمرے میں لگوادیا تھا۔ انورادھا کے ساتھ اشوک بھی اس کے سونے کے کمرے میں آگیا۔

"آدھی رات ہوگئی ہے۔ اب سوجاؤ تم تھکے ہوئے بھی بہت ہو۔"

"کیا میں تمہارے کمرے ہی میں سو جاؤں؟"

"لیکن یہاں تو ایک ہی پلنگ ہے۔"

"میں اپنا بستر فرش پر لگا لیتا ہوں۔"

"نیند نہیں آئے گی۔"

"دِیدی میں تو وہاں بھی فرش ہی پر سوتا تھا۔ بلکہ پلنگ

پر تو مجھے نیند بھی نہیں آئے گی ۔"

"ایز یُو لائیک ۔"

دونوں نے مل کر بستر فرش پر لگا دیا اور پھر دونوں تھوڑی دیر کے بعد اپنے اپنے بستر پر جم گئے ۔

بستروں پر وہ لیٹے ضرور تھے لیکن اُنہیں نیند نہیں آرہی تھی ۔

وہ دیر تک جاگتے رہے اور اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے رہے اور ماضی کی سیڑھیاں اُتر اُتر کر حال کے آنگن میں کھڑے ہو کر اپنے مستقبل کو جھانکتے رہے ۔

اس طرح باتیں کرتے کرتے دونوں سو گئے ۔ یہ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ پہلے کون سویا تھا ۔

انورادھا اور اشوک سوتے رہے اور کمرے کی روشنی جلتی رہی ۔ کہیں پچھلے پہر جب انورادھا کی نیند ٹوٹی تو اس نے روشنی بُجھائی ۔

اس نے دیکھا اشوک گہری نیند سو رہا تھا ۔

وہ کچھ لمحوں تک اپنے شکست خوردہ بھائی کے تھکے ہوئے چہرے کو نہارتی رہی اور اُس کے من پر اُداسی کی ہلکی ہلکی گھٹائیں چھاتی رہیں ۔

۱۱

اگلے دن انورادھا نے آفس سے چھٹّی لے لی اور اشوک کو سارا دن چنڈی گڑھ میں گھماتی رہی اور شام کو پنجور کے مغل گارڈنز میں لے گئی ۔ بہت دیر میں وہ لوگ واپس آئے ۔ نو بجے کے قریب انورادھا نے کوشل کو ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ اگلی صبح وہ اشوک کو شملہ لے جا رہی تھی ۔

"میری طرف نہیں آؤ گے آج ؟" ۔

"بہت تھک گئے ہیں ہم لوگ" ۔

"ڈِنر ہو گیا؟" ۔

"نہیں پنجور ہی میں بہت کچھ کھا پی لیا تھا ۔ اب کھانے کی اِچھّا نہیں" ۔

"اور کیا اچھّا ہے اس وقت؟" ۔

"اشوک سے گپ شپ اور پھر آرام" ۔

"تو میری طرف سے گُڈ نائٹ" ۔

"گُڈ نائٹ ٹُو یُو آلسو" ۔ انورادھا نے کہا ۔

بہت رات گئے انورادھا نے کوشل کو ٹیلی فون کیا ۔

" کیوں نیند نہیں آ رہی ؟"
"نہیں - ایک بات کہنی تھی" -
" کہو" -
"کل صبح اشوک کو شملہ لے جاؤں ؟" -
"ضرور لے جاؤ" -
" تم بھی چلو گے" -
" نہیں - اشوک کو اِس سمے تمہاری ضرورت ہے میری نہیں - اُسے جس مارل سپورٹ کی ضرورت ہے اس وقت وہ اُسے تم ہی سے مل سکتی ہے" -
" تو ہم صبح جلدی نکل جائیں گے" -
"ٹھیک ہے - ڈرائیور ہے کہ بھجواؤں؟" -
" اگر گاڑی تم نے ڈرائیو کرنی ہے تو ڈرائیور نہیں ہے - ورنہ ہے " - انورادھا یہ کہہ کر ہنسی - ٹیلی فون پر اس کی ہنسی بہت اچھی لگتی تھی کوشل کو - جب بھی اسے موقع ملتا وہ ٹیلی فون پر اس کی ہنسی ضرور سُنتا -
" تو اسی ڈرائیور سے کام چلاؤ - میں ایمرجینسی میں کام آجاؤں گا" -

اور پھر ٹیلی فون کٹ گیا۔ نہ انورادھا نے دوبارہ بات کی
اور نہ ہی کوشل نے۔

کوشل کا خیال تھا کہ انورادھا اُسے دوبارہ ٹیلی فون
کرے گی اور وہ اس کے ٹیلی فون کا انتظار کرتا رہا۔ انورادھا یہ
سوچتی رہی کہ کوشل اسے اوشیہ ہی ٹیلی فون کرے گا۔ دونوں
اپنی اپنی اَنا سے لڑتے رہے اور ٹیلی فون کسی نے نہ کیا۔ کبھی
کبھی یہ بے کار قسم کی اَنا کتنا پریشان کر دیتی ہے۔

دونوں کی ملاقات ایک دن کے بعد ہوئی۔ جب انورادھا
اشوک کو شملہ اور اس کے آس پاس کی جگہوں پر گُھما کر چنڈی
گڑھ واپس پہونچی۔

"چنبیلی کے پھُول تم خود بکھیرتے ہو گیٹ کے
سامنے یا وہ اپنے آپ بکھرتے رہتے ہیں؟"۔

انورادھا نے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے سوال
کیا۔ اشوک پاس کھڑا مُسکراتا رہا۔

"میں خود ہی بکھیرتا ہوں"۔

"چنڈی گڑھ میں اور سُورت میں کتنا فرق ہے۔ یہاں
آپ اپنے گیٹ کے سامنے پھُول بکھیرتے ہیں وہاں ہیلتھ

ڈیپارٹمینٹ کے کرم چاری گندگی کے ڈھیروں پر ڈی ڈی ٹی کی سفید چادر ڈالتے رہتے ہیں ۔ گندگی کا ڈھیر جتنا بڑا ہوتا ہے چادر کی موٹائی اور لمبائی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے"۔

"گندگی کے ڈھیروں کو فوراً نہیں ہٹاتے؟۔ کوشل نے پُوچھا۔

"گندگی ایک دم ہٹتی بھی تو نہیں ۔ چاہے وہ گلی کوچوں اور جُھگّی جھونپڑیوں میں بھری پڑی ہو چاہے انسان کے دل و دماغ میں"۔ جواب اشوک کے بجائے انوراد ھانے دیا۔

اور اس طرح گفتگو کرتے ہوئے تینوں سیڑھیاں چڑھ کر کوشل کے فلیٹ میں آگئے ۔ گفتگو جاری تھی ۔

"گندگی دُور کرنا طویل اور تھکا دینے والا پروسیس ہے ۔ ایک سٹیج پر پہونچ کر لوگ ہار جاتے ہیں اور ان کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے ۔ کیوں ڈاکٹر اشوک تمہارا کیا خیال ہے؟"۔

"آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں"۔

پھر سب لوگ ڈرائینگ رُوم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"تمہارا شملہ کا ٹرپ کیسا رہا ڈاکٹر؟"۔

"ٹایرنگ اینڈ ڈی پریسنگ بوتھ"۔

"ٹایرنگ تو میں سمجھ سکتا ہوں لیکن ڈی پریسنگ کیوں؟"

" کوشل صاحب ' جب میں انورادھا کے سنگ مال پر چکر لگا رہا تھا اور شاندار دکانوں اور اتنے ہی شان دار لوگوں کو ایک نپی تُلی رفتار سے گھومتے ہوئے دکھ رہا تھا تو مجھے سُورت کے سلمز اور ان میں مرتے ہوئے لوگ یاد آرہے تھے ۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس شہر میں اگر پلیگ سے ایک بھی موت ہو گئی تو یہ نازک طبع لوگ اپنی جگمگاتی دکانیں کُھلی کی کُھلی چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور مال پر گھومتے ہوئے آسودہ ۔ اور نازک مزاج مردوں اور عورتوں میں سے یہاں ایک بھی نظر نہ آئے گا ۔ چاہے انھیں گہری گہری کھڈوں میں ہی کودنا پڑے لیکن مال پر ان میں سے ایک کُشن بھی کوئی نہیں رُکے گا"۔

"بہت ڈسٹربنگ کمینٹس ہیں تمہارے ۔ واقعی بہت تھکے ہوئے اور ٹینس ہو تم اس وقت"۔

اشوک نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا۔

گرم گرم چائے کی پیالی پی کر ہی انورادھا اور اشوک کو ہوش آیا۔

اشوک تو ٹانگیں پھیلا کر صوفے میں جیسے دھنس گیا

تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ ٹیگ ٹیگ کا تھکا ہو۔
"وِسکی پیتے ہو؟"۔ کوشل نے پُوچھا۔
"کبھی کبھی پی لیتا ہوں"۔
"تمہیں اس وقت وِسکی کے ڈَبل پیگ کی ضرورت ہے۔ تمہاری تھکن اسی سے اُترے گی اور تمہارا ذہن بھی اسی سے صاف ہو گا"۔
"کوشل کے پاس تو ہر بیماری کا بس یہی علاج ہے"۔ انورادھا بولی۔
"تھکاوٹ بیماری نہیں ہے ڈیر انورادھا، صرف جسم کی ایک کیفیت ہے۔ خوف کی طرح یہ بھی من کی ایک کیفیت ہے"۔
"جانتی ہوں"۔
"دِیدی تُم بھی لیتی ہو وِسکی کبھی؟"۔
"کبھی کبھار جب کوشل ضد کرے"۔
"اس وقت کوشل صاحب ضد نہیں کریں گے؟"۔
"نہیں"۔
"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"۔

"میں کوشل کو تم سے زیادہ جانتی ہوں"۔
"ڈیڈی ایک بات کہوں"۔
"تم اب پہلے سے کہیں زیادہ بولڈ اور اوپن ہوگئی ہو"۔
"بڑی عجیب و غریب سچوایشنز سے گذرنے کے بعد یہاں پہونچی ہوں"۔

اس بیچ میں کوشل اُٹھ کر اپنے گھر میں بنے چھوٹے سے بار کی طرف چلا گیا تھا اور اپنے لیے اور اشوک کے لیے ڈرنک بنا رہا تھا۔ شاید اس نے دونوں کی گفتگو نہیں سُنی تھی۔

وہ ٹرے میں وسکی اور سوڈے سے بھرے دو گلاس لے آیا جن میں برف کے ٹکڑے چمک رہے تھے۔ وہ ڈرنک خود ہی بناتا تھا۔ کسی دوسرے سے نہیں کہتا تھا ــــ ڈرنک بنانے میں جو ایک لطف ہے اسے میں کسی کے ساتھ نہیں بانٹتا۔ جتنا نشہ ڈرنک بناتے ہوئے ہوتا ہے اتنا نشہ پینے کے بعد بھی نہیں ہوتا ــــ کوشل کی اپنی فلاسفی تھی اور اپنا نظریہ تھا۔ وہ کسی سے میل کھائے یا نہ کھائے اس کی پرواہ وہ نہیں کرتا تھا۔ اس کی یہی ادا انورادھا کو پسند تھی۔ ایک خاص طرح کی انا تھی اس میں۔ اس سے وہ کسی کو ہرٹ تو نہیں کرتا تھا لیکن

کاپروماییز بھی نہیں کرتا تھا۔

ایک گلاس اشوک کی طرف بڑھاتے اس نے انورادھا سے پُوچھا۔

"تم کیا لو گی؟"۔

"میں تم دونوں کو پیتے ہوئے دیکھوں گی"۔

"تو دیکھتی رہو"۔

کوشل اور اشوک نے اپنے اپنے گلاس اٹھائے اور ہونٹوں سے لگالئے۔ اشوک کے پینے کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ پینے کا عادی نہیں تھا۔

"تم نے شانتی کو بھی کبھی پلائی تھی؟"۔

"نہیں کوشل صاحب۔ ہماری وہ سٹیج ابھی نہیں آئی تھی"۔

"کب آتی ہے وہ سٹیج؟"۔

"مجھے معلوم نہیں حضور"۔

"یوں ہی غلط سلط سوال کیے جاؤ معصوم لڑکے سے"۔ انورادھا بولی۔

"اتنا معصوم نہیں ہے جتنا تم سمجھتی ہو اِسے۔ پیار کسی

کو معصوم نہیں رہنے دیتا انورادھا صاحبہ"۔
"تمہاری باتیں تم ہی جانو۔ سمجھ سوچ کے پلانا بے چارے کو"۔
"بڑا ترس آرہا ہے بھائی پر۔ کبھی ہم پر بھی ترس کھالیا کرو"۔
"دو گھونٹ پی کر نشہ ہو گیا؟"۔
"نشہ تو مجھے ڈرنک بناتے ہی ہو جاتا ہے"۔
"معلوم ہے مجھے۔تم پیو مجھے اشوک سے کچھ پوچھنا ہے"
"تو مجھے نہیں پینے دو گی، دیدی؟"۔اشوک نے ہنستے ہوئے کہا۔
اس کی بات سُن کر کوشل نے زور کا قہقہہ لگایا۔ وہ بہن بھائی کی نوک جھونک کا لُطف لے رہا تھا۔
"میرا خیال ہے اپنے لیے ڈرنک بنا لو تُم بھی"۔
انورادھا اپنے لیے ڈرنک بنانے بار کی طرف چلی گئی۔
کوشل نے اپنے گلاس سے ایک لمبا سِپ لیتے ہوئے اشوک کو مخاطب کیا۔
"تمہارا کیا خیال ہے، پلیگ کنٹرول ہو جائے گی؟"۔

"کنٹرول تو خیر ہو جائے گی ۔سرکار اب تو وار فُٹنگ پر
انتظام کر رہی ہے ۔ دوائیوں کی کمی نہیں ۔ حفاظتی تدبیریں
بھی کی جا رہی ہیں۔ لیکن اس بیماری سے سب سے بڑا نقصان
یہ ہوا ہے کہ انٹر نیشنل لیول پر ہماری ساکھ ختم ہو گئی ہے ۔
سبھی ملکوں نے اپنی فلایٹس بند کر دی ہیں ۔ ہندوستانی تو
جیسے مجرم قرار دے دیئے گئے ہیں گجرات کا آدمی جہاں بھی کہیں
جاتا ہے اسے شک اور شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے سُورت اب
ہیروں کا نہیں موت کا تاجر بن گیا ہے ۔"
"ٹورازم کو بھی بے حد نقصان ہوا ہے ۔ غیر ملکی
ٹورسٹس نے ہوٹلوں میں اپنی اپنی بُکنگز کینسل کروادی ہیں ۔
ابھی تو خبریں حوصلہ افزا نہیں ہیں ۔
"ابھی تو کچھ دن حالات ایسے ہی رہیں گے"۔ وہ بولا اور
پھر اُس نے ایک ہی گھونٹ میں آدھا گلاس ختم کر دیا"۔
انورادھا اپنی ڈرنک بنا لائی تھی اور خاموشی سے
دھیرے دھیرے پی رہی تھی ۔اور دونوں کی گفتگو سن رہی تھی
"سُورت سے ابھی اور بھی ڈاکٹر بھاگیں گے کیا؟"۔
"کہہ نہیں سکتا کچھ' کوشل صاحب ۔ سبھی ڈاکٹر تو میری

طرح کمزور نہیں ہوں گے"۔

"پرسوں کے اخبار میں چھپی ایک تصویر دیکھی تھی تم نے ۔ ایک بھائی اپنے منہ کو کپڑے سے ڈھکے ہوئے ۔ اپنے کندھے پر اپنی بہن کی لاش کو اٹھائے شمشان کی طرف جارہا ہے"۔

"میں نے دیکھی ہے وہ تصویر ۔ انسانی رشتوں کی اہمیت ابھی باقی ہے، کوشل صاحب ۔ موت نے انسانیت کو ابھی پوری طرح تباہ نہیں کیا"۔

"تم وِسکی بہت آہستہ پی رہے ہو ۔ اس طرح تو تمہاری تھکاوٹ نہیں اُترے گی"۔

اشوک نے کوشل کی بات کا جواب نہیں دیا ۔ اس کی طرح مُسکرا کر دیکھا اور گلاس کو ہونٹوں سے لگا لیا ۔ ایک اور لمبا سِپ لیتے ہوئے اس نے کہا ۔

"ڈر کے بارے میں جو کچھ آپ نے کہا تھا، میں تین دن سے اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں"۔

"میں چنڈی گڑھ میں گھومتے ہوئے، شملہ جاتے ہوئے اور وہاں گھومتے ہوئے اور پھر واپس آتے ہوئے، ڈیڈی سے

بس اسی ٹاپک پر بات کرتا رہا ہوں"۔
"بس ایک ہی سنک سوار ہے اس پر"۔ انورادھا نے پہلی بار گفتگو میں حصّہ لیا اور اپنا گلاس صوفے کے ساتھ والے پیگ ٹیبل پر رکھ دیا"۔
" کون سی سنک"۔ کوشل نے پوچھا۔
" کہتا ہے اگر میں ڈر کر سُورت سے نہ بھاگ نکلتا تو شاید کچھ لوگوں کی جانیں بچ جاتیں۔
کہتا ہے اس کے اس طرح شہر چھوڑنے سے مرنے والوں کی تعداد میں بڑھوتی ہوئی ہے"۔
" کیوں اُستاد ٹھیک کہہ رہی ہے تمہاری دِیدی ؟"۔
"جی ٹھیک کہہ رہی ہے"۔
کوشل نے اس کا جواب سُنا۔ لمحہ بھر کے لیے اُٹھ کر خالی گلاس اٹھائے اور ان میں وِسکی اور سوڈا ڈال کر واپس آگیا۔ ایک گلاس اس نے اشوک کی طرف بڑھایا اور دوسرا خود سنبھال لیا۔ انورادھا نے اپنا گلاس دوبارہ اُٹھالیا تھا۔
" تمہارا اپنا کیا خیال ہے ؟"۔
" میں سوچتا ہوں کہ مجھے سُورت نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔

وہیں رہنا چاہیے تھا اور بیماروں کی دیکھ بھال کرنی چاہیے تھی"۔
"تمہارا کیا خیال ہے انورادھا؟"۔
"آئی فلی ایگری وِتھ ہم"۔ وہ بولی
"ایک ہیرے کو ہیروں کا شہر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس سے ہیروں کی چمک کم ہوجائے گی"۔
اشوک خوب کھُل کر ہنسا کوشل کی بات پر
"لگتا ہے آپ کو پتھروں کی سائینس کی کافی سٹڈی ہے"
"زندگی بھر پتھروں ہی سے تو سر ٹکراتا رہا ہوں۔ اور کیا بھی کیا ہے؟"۔
"اور حیرت یہ ہے کہ کوشل کا سر پھر بھی سلامت ہے"
انورادھا کے اس کمینٹ پر سب کھُل کر ہنسے۔
"تم اپنے سر کا تو دھیان کرو۔ ختم نہیں کروگی تو سر گھوم جائے گا"۔ یہ کہہ کر کوشل نے انورادھا کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا اور اس نے گلاس ایک ہی بار ختم کر ڈالا۔
کوشل کے اصرار کے باوجود انورادھا اور اشوک کھانے

کے لیے نہیں رُکے ۔ کوشل نُھیں سی اوف کر کے اوپر آ گیا ۔

نو کر آج چھٹی پر تھا اس لیے اوز جھنجھٹ نہیں تھا جس کا خیال اسے کرنا تھا ۔ اس کے سر میں شدید دور تھا ۔ اس نے دروازے بند کئے ۔ روشنیاں بجھائیں اور کپڑے تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر گر گیا ۔ اس کا سر بُری طرح چکرا رہا تھا ۔

۱۲

بارہ بجنے کو تھے جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

عام طور سے کوشل لیٹ نائٹ فون کالز، اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس کے دوست گیارہ بجے کے بعد اُسے ٹیلی فون نہیں کرتے تھے۔

مسلسل گھنٹی بجتے رہنے سے وہ مجبوراً بستر سے اُٹھا اور ٹیلی فون کا رِسیور اُٹھایا۔

"اشوک ایٹ دِس اینڈ۔ سوری ٹو ڈسٹرب یُو، کوشل صاحب"

"کہو"۔

"ڈیڈی نے کہا بھی تھا کہ اس وقت آپ کو فون نہ کروں"

"لیکن تم نے اس کی بات نہیں مانی۔ وہسکی کا یہی فائدہ ہوتا ہے"۔

کوشل نے ہنستے ہوئے کہا

"آپ ڈیڈی سے بات کریں"۔

"سم تھنگ ویری ارجنٹ ' انو ؟"۔

"یس ۔ اشوک صبح شتابدی سے جانا چاہتا ہے "۔

" کیوں ؟"۔

" کہتا ہے ' جس مارل سپورٹ کی اُسے ضرورت تھی ' وہ اُسے مل گئی ہے ۔ اب اُسے یہاں نہیں رُکنا چاہیے "۔

"ونڈرفُل ۔ ٹرین کا ٹکٹ کہاں سے لیا ہے اُس نے ؟"۔

" صبح سٹیشن ہی پر ٹرائی کرے گا ۔ ٹکٹ مل جائے گا"۔

"اس کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے ۔ اسے واپس چلے جانا چاہیے"

"صبح چھ بجے سے پہلے آجانا ۔ اشوک کو سٹیشن چھوڑ آئیں گے "۔

" آئی وِل کم ۔ گُڈلک ٹُو اشوک "۔

اشوک اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن کوشل نے ری سیور رکھ دیا تھا ۔

اگلی صبح کوشل اور انورادھا ' اشوک کو شتابدی ایکسپریس سے بھیجنے چنڈی گڑھ ریلوے سٹیشن پر گئے تھے ۔

کوشل صبح سویرے تیار ہونے کا عادی نہیں تھا ۔ اس بات کا علم انورادھا کو بھی تھا ۔ لیکن اس وقت مسئلہ اشوک کو

واپس بھیجنے کا تھا ۔ کوشل نہیں چاہتا تھا کہ اشوک کے فیصلے کو علمی جامہ پہنانے میں تاخیر کی جائے ۔ وہ وقت سے پہلے ہی انورادھا کے گھر پہنچ گیا تھا ۔ گاڑی کا ہارن بجا کر وہ گاڑی ہی میں بیٹھا رہا تا کہ وقت ضائع نہ ہو ۔

سٹیشن پر مسافروں کی تعداد بہت کم تھی ۔ پلیگ کی وبا نے یہاں بھی لوگوں میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی ۔ شاید وہ چنڈی گڑھ چھوڑ کر ' اس وقت کہیں نہیں جانا چاہتے تھے ۔ انھیں اب ہر جگہ خطرہ نظر آنے لگا تھا ۔ اشوک کو ٹکٹ آسانی سے مل گیا ۔ کچھ دیر تو انورادھا اشوک سے بات کرتی رہی ' پھر اچانک خاموش ہو گئی ۔ وہ ایک دم بہت اداس ہو گئی تھی ۔ اس کے پاس جتنی مارل سپورٹ تھی وہ تو اس نے اشوک کو دے ڈالی تھی ۔ اب تو اسے خود سپورٹ کی ضرورت تھی ۔ اشوک کچھ دیر کوشل سے بات کرتا رہا اور اس کا شکریہ ادا کرتا رہا کہ اُس نے اُسے ایک نئی روشنی دی تھی ۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن میں اتنا آتم وشواس ہوتا ہے کہ وہ اس وشواس کو دوسروں تک پہونچا کر ان کا کردار بھی مضبوط کر دیتے ہیں ۔

"میں بہت شکر گزار ہوں آپ کا کوشل صاحب ۔ آپ

سے مجھے صحیح رہنمائی ملی ہے"۔ کوشل نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا۔

"اِٹ اِز فارٹی ٹیوڈ دیٹ میٹرز اِن لائف ۔ بی بریو اینڈ فیس دی کرائی سِس"۔

"تھینکس، کوشل صاحب"۔

اشوک کی آنکھیں گیلی ہونے لگی تھیں ۔ وہ اپنے کمپارٹمینٹ کی طرف بڑھ گیا ۔ ٹرین پلیٹ فارم سے سرکنے لگی تو اشوک نے کمپارٹمینٹ کے پائیدان پر پاؤں رکھتے ہوئے انورادھا سے کہا۔

"تمہاری شناخت کوشل بھائی صاحب ہیں ۔ لیکن میری شناخت وہ بے سہارا اور محتاج لوگ ہیں، جو اِس وقت سُورت کی جُھگی جھونپڑیوں میں دم توڑ رہے ہیں ۔ میں انھی کے پاس جا رہا ہوں ڈِیدی ۔ مجھے آشیر واد دو"۔

اشوک بھی انورادھا کی طرح اپنی گیلی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے دونوں کو ویو کر رہا تھا ۔ دِھیرے دِھیرے ٹرین پلیٹ فارم چھوڑ گئی ۔

طلوع ہوتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں پلیٹ فارم

کے کھلے حصے پر پھیلتی جا رہی تھیں ۔ گنتی کے لوگ جو اپنے سگے سمبندھیوں کو سی اوف کرنے آئے تھے سٹیشن سے باہر جا رہے تھے ۔

انورادھا نے اپنی کچھ کچھ گیلی پلکیں اوپر اٹھائیں اور پھر مسکرا کر کوشل کی طرف دیکھا ۔ سورج کی پہلی سنہری کرنوں میں اس کی پلکوں کی نمی چمکنے لگی تھی ۔

"کیا ارادے ہیں اب ؟" ۔

"گھر چلتے ہیں اور ناشتہ کرتے ہیں" ۔

"نہیں" ۔

"تو تم بتاؤ" ۔

"آج اتوار ہے ۔ چنڈی مندر چلتے ہیں" ۔

انورادھا کو کوشل سے زیادہ چنڈی دیوی میں وشواس ہے ۔جس کی مورتی کی ستھاپنا ' اس جگہ پر پانڈوؤں نے صدیوں پہلے کی تھی ' جب وہ اپنی جِلاوطنی کا آخری زمانہ ' اس علاقے میں گزار رہے تھے ۔جہاں گھنے جنگل تھے اور آبادی صرف نام کو تھی ۔

سٹیشن سے باہر نکلنے سے پہلے کوشل نے ریلوے

سٹیشن کے بُک سٹال سے آج کا اخبار لیا۔
تین اہم سُرخیاں تھیں۔
"دہلی میں پلیگ کے کیس چار گُنا ہو گئے"
"پنجاب میں بھی، دہلی کی طرح، سکول اور کالج پندرہ روز کے لیے بند کر دئے گئے"۔
"ہریانہ میں، دہلی سے ملحقہ چار ضلعوں میں سکول اور کالج بند"۔
انورادھا اور کوشل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انورادھا اخبار کی سُرخیوں کی تفصیل پڑھنے لگی اور کوشل نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔
کوشل اور انورادھا دونوں خاموش تھے۔
دونوں کے دِلوں میں گہرے وسوسے تھے۔
شاید اَن گِنت لوگوں کی طرح اُنھیں بھی اپنی اپنی شناختیں در کار تھیں۔

